تدبّر

زیرِ نگرانی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّر قرآن وحدیث

تدبّر

شمارہ نمبر ۱۲ صفر ۱۴۰۵ھ نومبر ۱۹۸۴ء

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ

تدبر کی اشاعت میں تاخیر ——— خالد مسعود ۳

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۂ آلِ عمران (۱) ——— خالد مسعود ۵

اصولِ تدبرِ حدیث

تدبرِ حدیث کے چند بنیادی اصول ——— امین احسن اصلاحی / ماجد خاور ۹

حکمتِ قرآن

خیر و شر کا مسئلہ — فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں
——— امین احسن اصلاحی / محبوب سبحانی ۱۶

مراسلہ و مذاکرہ

تقدیر اور تدبیر کا تعلق ——— خالد مسعود ۴۷

مجلسِ ترتیب :

- ــــــ خالد مسعود (مدیر)
- ــــــ عبداللہ غلام احمد
- ــــــ ماجد خاور
- ــــــ محبوب سبحانی

ناشر : ــــــــــــ ادارہ تدبرِ قرآن وحدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور - ۲۵

مطبع : ــــــــــــ المطبعۃ العربیۃ - لاہور

قیمت : ۴/۰ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

خالد مسعود

تدبّر کی اشاعت میں تاخیر

تدبر کا بارھواں شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور اس کی عنایت ہے کہ رسالہ تین چار ماہ کے وقفے سے قارئین تک پہنچ جاتا ہے۔ گزشتہ تین سالوں کے دوران رسالے کے بارے میں ادارہ کو جو خطوط موصول ہوئے ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ادارہ کی مساعی رائیگاں نہیں جا رہی ہیں۔ قارئین اس کے ہر شمارہ کے لیے چشم براہ ہوتے ہیں۔ رسالہ کے مضامین کو وہ فکرانگیز اور نئی معلومات سے مالا مال پاتے ہیں۔ معیار کو وہ اس قدر بلند سمجھتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں اتنا معیاری اور باوقار رسالہ اس وقت کوئی دوسرا موجود نہیں۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے ادارہ تدبر قرآن وحدیث کے کارکنان کو یہ توفیق ارزانی فرمائی ہے کہ وہ اس کے دین کو سمجھنے سمجھانے کی یہ خدمت انجام دے سکیں۔

قارئین کو رسالہ سے اگر کوئی شکایت ہے تو صرف یہ کہ اس کی اشاعتوں کے مابین وقفہ بہت طویل ہوتا ہے۔ بعض کرم فرما یہ تقاضا کر چکے ہیں کہ رسالہ کو ماہانہ کیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس کو زیادہ سے زیادہ دو ماہ کے وقفہ سے چھاپا جائے۔ یہ تقاضا رسالے کی قدرافزائی کی دلیل ہے۔ ادارہ کی خواہش بھی یہی ہے کہ وہ اس علمی خدمت کو زیادہ خوش اسلوبی سے اور جلد جلد اس کے طالبوں تک پہنچائے لیکن بوجوہ ایسا کرنا فی الحال مشکل ہے۔

اوّلاً قارئین اس حقیقت سے آگاہ ہوں گے کہ ادارہ تدبر قرآن وحدیث اس مقصد کے ساتھ وجود میں آیا تھا کہ یہ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ کے علمی اور تحقیقی کاموں میں ان کو اپنا تعاون پیش کرے گا تاکہ وہ اپنی عظیم تصنیف ــــ تفسیر تدبرِ قرآن ــــ سے فراغت کے بعد تدبرِ حدیث اور حکمتِ قرآن کے موضوعات پر اپنے فکر کو مرتب اور تحریر میں لا کر اسے دوسروں کے لیے استفادہ کے قابل بنا سکیں۔ ادارہ نے تدبر کو اسی مقصد کے لیے خاص کر رکھا ہے۔ لوگوں کے پاس علمی سوتوں کی اتنی فراوانی ہوتی ہے کہ جب مصلحتِ وقت کا تقاضا ہو وہ اپنے نصف سوتوں تک سے بھی دست کش ہونے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ لیکن ادارہ تدبر قرآن وحدیث وحدتِ فکر

کو اہمیت دیتا ہے اور اسی ایک علمی سوتے سے سیرابی پر قانع ہے۔ اس نے اپنی تگ و دو کی جو حد بندی کی ہے اس کے لحاظ سے تدبر کے مضامین کے انتخاب کے دائرہ کو بھی یہ محدود رکھنے پر مجبور ہے۔ اسی لیے قارئین نے دیکھا ہوگا کہ اب تک تدبر میں لکھنے والوں کے ناموں میں یکسانی پائی جاتی ہے۔ ثانیاً، علمی و تحقیقی مضامین کی تیاری کافی وقت اور محنت چاہتی ہے۔ خصوصاً جب نئے عنوانات پر لکھا جا رہا ہو۔ پرانے مضامین کو نیا رنگ دے کر چھاپنا ہو تو یہ نسبتاً ایک آسان کام ہے اور بہ ضرورت بیسیوں جرائد پوری کر رہے ہیں۔ قارئین نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ تدبر میں تقریباً ہر موضوع، جس پر قلم اٹھایا گیا، نیا تھا۔ یہ چیز اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ پرچہ چھپنے میں تاخیر کی پروا کیے بغیر تحریر اور تحقیق کے معیار کو اولیت دی جائے۔ ظاہر ہے کہ تدبر حدیث کے عنوان سے لکھنا جب کہ اس تحریر میں تدبر کو کوئی دخل نہ ہو، ایک مذاق ہے اور حکمتِ قرآن پر مضمون نویسی کرنا، جب کہ قرآن کی حکمت اس مضمون کے قریب بھی نہ پھٹکی ہو ایک معصیت ہے۔ ادارہ اس طرح کی حرکت کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔

ثالثاً، یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ ادارہ تدبر قرآن و حدیث جن لوگوں نے قائم کیا ہے، اتفاق سے وہ مصروف لوگ ہیں جو اپنے اوقات میں سے کچھ وقت نکال کر تدبر کے لیے لکھتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ نہیں ہیں جو فکرِ معاش سے آزاد ہو کر صرف اسی کام کے لیے وقف ہو گئے ہوں۔ ادارہ کو ایسے اہلِ ثروت کی تائید بھی ابھی تک حاصل نہیں ہو سکی جو اپنے بے لوث تعاون کے ذریعے ادارہ کو اس قابل کر دیتے کہ وہ کم از کم کسی ایک کارکن کو علمی و تحقیقی کام کے لیے فارغ کر دیتا۔ اگر ایسا ہو سکتا تو رفتارِ کار تیز تر ہو سکتی تھی اور اس صورت میں تدبر کی اشاعت بھی کم وقفے سے کرنا ممکن ہو جاتا۔

یہ مشکلات ایسی ہیں جن کے ہوتے ہوئے قارئین کی خواہش پر رسالے کی اشاعت کے وقفہ کو کم کرنا فی الحال ممکن نہیں۔ اگر خدا نے چاہا اور ادارہ کو ایسے وسائل میسر آ گئے جن کو بروئے کار لا کر وہ اپنے کارکنوں کو ہمہ وقتی تحقیق کے کام پر لگا سکے تو ان شاء اللہ نہ صرف تدبر کی اشاعت جلد ممکن ہو جائے گی، بلکہ بعض اہم موضوعات کو بھی زیرِ تحریر لایا جا سکے گا جن پر کام کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

متدبرِ قرآن

خالد مسعود

تفسیر سورۂ آلِ عمران (۱)

شروع خدائے رحمان و رحیم کے نام سے ۝

یہ[1] آلٓمٓ ہے ۝ اللہ ہی معبود ہے، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی، زندہ اور قائم رکھنے والا[2] ۝ اس نے تم پر کتاب اتاری حق کے ساتھ تصدیق کرتی ہوئی اس کی جو اس کے آگے سے موجود ہے[3] اور اس نے تورات اور انجیل اتاری ۝ اس سے پہلے لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر۔ اور پھر فرقان اتارا[4]۔ بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے ۝ اللہ سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں ۝ وہی ہے جو تمہاری صورت گری کرتا ہے رحموں کے اندر جس طرح چاہتا ہے[5]۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی، وہ غالب اور حکیم ہے ۝ ۶

مضمون: اس سورہ کا موضوع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ اللہ کی طرف سے صرف دینِ اسلام ملا ہے۔ اس دین میں تقسیم و تجزیہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس دین کا مطالبہ ہر حالت میں اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام کی فرمانبرداری ہے، خواہ حالات نرم ہوں یا سخت۔

[1] دیکھیے حاشیہ [1] سورہ بقرہ۔

[2] یہ صفات یہاں کتابِ الٰہی کی ضرورت کے اثبات کے پہلو سے بیان ہوئی ہیں۔ وہ زندہ خدا ہے اس لیے وہ دیکھتا ہے کہ اس کے بندے اپنی زندگی میں وہ رویہ اختیار کریں جو اسے پسند ہو۔ وہ قائم رکھنے والا ہے اس لیے دنیا کو عدل و حق پر استوار رکھنے کے لیے اس نے انبیا بھیجے اور کتابیں اتاریں۔

[3] یعنی پچھلے صحیفوں کی صحیح تعلیمات اور ان میں بیان کردہ پیشین گوئیوں کی تصدیق قرآن سے ہوئی۔

[4] یعنی جب تورات و انجیل میں تحریف ہو گئی تو قرآن کو فرقان یعنی حق و باطل کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بنا کر اتارا۔

[5] یعنی جس نے صورت گری فرمائی تو کیا وہ بھی بے خبر ہو سکتا ہے؟ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ کتابِ الٰہی کے مخالفین یا بالفاظ دیگر عدل و قسط کے باغی دائمی عذاب سے دوچار ہوں گے۔

وہی ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری جس میں محکم[۶] آیات ہیں جو اصل کتاب کا درجہ رکھتی ہیں اور دوسری کچھ آیتیں اس میں ایسی ہیں جو متشابہ[۷] ہیں۔ تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس میں سے متشابہات کے درپے ہوتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کریں حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا[۸]۔ تو جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ یہ سب ہمارے رب ہی کے پاس سے ہیں۔ اور یاد دہانی تو اہل عقل ہی حاصل کرتے ہیں ۝ اے[۹] ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت بخشنے کے بعد کج نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش۔ تو نہایت بخشنے والا ہے ۝ اے ہمارے پروردگار! تو سب لوگوں کو ایک ایسے دن کے لیے جمع کر کے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا ۝ ۹

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، نہ ان کے مال خدا کے ہاں کچھ کام آئیں گے، نہ ان کی اولاد[۱۰]۔ اور وہی لوگ دوزخ کے ایندھن بنیں گے ۝ ان کا بھی وہی حال ہونا ہے جو آلِ فرعون اور ان لوگوں کا ہوا جو ان سے پہلے گزرے۔ انہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا اور اللہ سخت پاداش والا ہے ۝ ۱۱

---

[۶] مراد وہ آیات ہیں جو آفاق و انفس کی بدیہیات، خیر و شر کے مسلمات اور معروف و منکر کے قطعیات پر مشتمل ہیں۔ فطرت انسانی کے اندر ان کی جڑیں نہایت مستحکم ہیں۔ بقیہ ساری کتاب کا مرجع و مرکز یہی محکم آیات ہوتی ہیں۔

[۷] متشابہ یعنی جن میں انسان کے مشاہدات و معلومات کے دسترس سے باہر کی باتیں تمثیلی و تشبیہی رنگ میں بیان ہوتی ہیں مثلاً احوال آخرت یا خدا کی صفات و افعال میں سے تمثیلی رنگ میں بیان کی ہوئی چیزیں۔

[۸] یہ رویہ بیان کیا ہے ان لوگوں کا جو قرآن کا انکار کر رہے ہیں کہ وہ اس میں ایسی چیزیں ڈھونڈتے ہیں جن کی آڑ لے کر وہ لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر سکیں۔ (بقرہ ۲۶، مدثر ۳۱) چنانچہ وہ متشابہات کے اندر موشگافی اور کرید کر کے لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کرتے ہیں۔ یہ یہود اور نصاریٰ دونوں کی عام بیماری تھی۔

[۹] یہ علم و عقل کی پختگی والوں کا حال ہے کہ وہ محکمات کی طرح متشابہات کی بھی قدر کرتے اور ان کو اضافۂ علم کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان میں کوئی چیز ان کی عقل سے ماورا ہوتی ہے تو اس کو خدا کے علم و حکمت کے حوالہ کرتے ہیں۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں شیاطین کی وسوسہ اندازیوں سے محفوظ رکھے اور ایمان کی دولت سے بہرہ یاب فرمانے کے بعد اس پر ثبات قدم عطا فرمائے۔

[۱۰] لوگوں سے مراد یہاں قرآن کے منکرین ہیں اور مال و اولاد کا ذکر قبول حق کی راہ کے اصل حجاب کی حیثیت سے ہوا ہے۔ فرمایا کہ درحقیقت مال و اولاد کی محبت انہیں قرآن کی پیش کردہ سچائیوں کے آگے جھکنے سے روک رہی ہے لیکن وہ اس کو چھپانے کے لیے متشابہات کے اندر سے کچھ اعتراضات و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا ہے یہ کہہ دو کہ تم مغلوب[۱۱] ہو گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے ۝ جن دو گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی ان کی سرگزشت میں تمہارے لیے نشانی ہے[۱۲]۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، دوسرا کافر تھا، یہ ان کو کھلم کھلا ان سے دوگنے دیکھتے تھے[۱۳] اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی تائید سے مدد فرماتا ہے۔ اس میں آنکھیں رکھنے والوں کے لیے بصیرت ہے ۝ ۱۳

لوگوں کی نگاہوں میں مرغوباتِ دنیا عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے[۱۴]، چوپائے اور کھیتی کھبا دی گئی ہیں[۱۵]۔ یہ دنیوی زندگی کے سروسامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے ۝ ان سے کہو کیا میں تمہیں ان چیزوں سے بہتر چیز کا پتہ دوں[۱۶]؟ جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوشنودی ہو گی۔ اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ہے ۝ جو یہ دعا کرتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے پس تو ہمارے گناہوں کو بخش اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا ۝ جو صابر، راست باز، فرمانبردار،

---

[۱۱] یعنی تمہاری سازشیں کامیاب ہونے والی نہیں ہیں اور تم قرآن کے حاملین کے ہاتھوں شکست کھاؤ گے۔

[۱۲] مراد جنگ بدر کا واقعہ ہے جس میں قرآن کے حاملین کو غلبہ حاصل ہوا۔

[۱۳] کفار نے مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھا۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی خاص تائید و نصرت کی وجہ سے ہوئی۔ انفال ۴۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے بالفعل شروع ہو جانے کے بعد فرشتوں کی شرکت سے مسلمانوں کی فوج کو اتنی فوقیت حاصل ہو گئی کہ وہ کفار کی نگاہوں میں ان سے دوگنی نظر آنے لگی۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو قطرے کو دریا اور ذرے کو آفتاب بنا دے۔ فتح و شکست کا اصل سررشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

[۱۴] اصیل اور نفیس گھوڑوں پر بالعموم نشان لگایا جاتا ہے اس وجہ سے نشان زدہ ہونا اصالت اور عمدگی کی تعبیر کے لیے معروف ہے۔

[۱۵] نگاہوں میں کھب جانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے لیے ان سے الگ ہو کر کسی چیز کو دیکھنا ممکن ہی نہ رہ جائے۔ وہ ہر چیز کو تولنے اور پرکھنے کے لیے انہی کو پیمانہ اور کسوٹی قرار دے لے۔ کسی چیز کی رغبت کا اس درجہ غلبہ فاطر کے منشا کے خلاف ہے اور اسے شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

[۱۶] یہ مخاطبین کو زاویہ نگاہ بدلنے کی دعوت ہے۔ دنیا کی چند روزہ زندگی کو کل زندگی سمجھ کر ساری بھاگ دوڑ اسی دنیا کی مرغوبات تک محدود کر لینے والوں کے دل میں قرآنی اقدار کی طلب پیدا نہیں ہو سکتی۔

راہ خدا میں خرچ کرنے والے اور اوقاتِ سحر میں مغفرت چاہنے والے ہیں[17] ۝ ۱۷

اللہ، فرشتوں اور اہلِ علم کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عدل و قسط کا قائم رکھنے والا ہے[18]،
اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب اور حکمت والا ہے ۝ ۱۸
اللہ کا اصل دین اسلام ہے[19]۔ اہلِ کتاب نے تو اس میں اختلاف علمِ حق کے آجانے کے بعد محض باہمی ضدم ضدا کے سبب سے کیا ہے۔ جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کریں گے تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے ۝ ۱۹ اگر وہ تم سے اس بارے میں جھگڑتے رہیں تو تم ان سے کہہ دو کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کیا اور اہلِ کتاب اور امیوں[20] سے پوچھو کہ کیا تم بھی اسی طرح اسلام لاتے ہو؟ اگر وہ بھی اسی طرح اسلام لائے تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعراض کریں تو تمہارے اوپر ذمہ داری صرف پہنچا دینے کی ہے، اللہ اپنے بندوں کا نگرانِ حال ہے ۝ ۲۰

---

[17] یہ قرآن کے حاملین کی صفات ہیں۔ تقویٰ سے مراد خدا کے ٹھہرائے ہوئے حرام و حلال کی پابندی ہے، صبر کی حقیقت حق پر جزم و استقامت ہے۔ راست بازی کا تقاضا زبان اور دل میں ہم آہنگی اور عمل اور قول میں مطابقت ہے اور فرمانبرداری (قنوت) کی اصل روح اللہ جل شانہ کے لیے تواضع و تذلل ہے۔

[18] اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت اور اپنے قائم بالقسط ہونے پر یہ گواہی آفاق و انفس اور وحیِ آسمانی کی صورت میں دی ہے۔ نظامِ کائنات اس طرح قائم ہے کہ وہ اپنے وجود سے یہ شہادت دے رہا ہے کہ اس کا خالق ایک ہی ہے اور اس نے ایک ایسی میزان رکھی ہے کہ مجال نہیں کہ کوئی شے اپنے معین محور و مدار سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہو سکے۔ اس نے انسان کی فطرت میں توحید کا شعور اور عدل پسندی رکھی ہے اور اس کے پیغمبروں نے ہمیشہ اسی حقیقت کی منادی کی ہے۔ ملائکہ کی گواہی ایک امرِ واقعی ہے اور وہ اسی حقیقت کے نفاذ کا ذریعہ ہیں۔ اہلِ علم سے مراد مصلحین و مجددین ہیں جو ہر زمانہ میں عقائد کو توحیدِ خالص کی بنیاد پر اور شرائع و قوانین اور اعمال و اخلاق کو حق و عدل کی اساس پر استوار کرنے کی جد و جہد کرتے رہے ہیں۔

[19] اصل دین سے مراد وہ دین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو صحیح زندگی گزارنے کا طریقہ بتانے کے لیے اتارا۔ اس کا نام اسلام ہے۔ یہ دین عدل و قسط کی میزان ہے۔ اسی دین پر فطرتِ انسانی کی تخلیق ہوئی ہے، یہ اس کائنات کے تمام نظام تکوینی میں نافذ ہے اور یہی دین اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں اور رسولوں پر اتارا۔

[20] امی، مدرسی و کتابی تعلیم و تعلّم سے ناآشنا کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اہلِ کتاب کے بالمقابل اسماعیل عربوں کے لیے بطور لقب استعمال ہوتا ہے۔ یہ قریش کو خبردار کیا ہے کہ لوگوں کے اسلام کی راہ اختیار کر لینے کے بعد ان پر اتمامِ حجت ہو گیا ہے۔ اب معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

اصول تدبر حدیث
امین احسن اصلاحی

تدبّر حدیث کے چند بنیادی اصول

علمِ رسول کے اس عظیم سرمایہ سے جو احادیث کی شکل میں امت کو منتقل ہوا حقیقی معنوں میں فیض یاب ہونے کے لیے تدبّرِ حدیث ضروری ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حدیث کے طالب علم کے پیشِ نظر چند بنیادی رہنما اصول رہنے چاہئیں۔ ان سے ہٹ کر اگر اس فن کا مطالعہ کیا جائے گا تو نہ صرف یہ کہ جگہ جگہ الجھنیں پیدا ہوں گی، بلکہ ٹھوکر کھانے اور بھٹکنے کا بھی احتمال ہے۔ جو شخص ان خطرات سے محفوظ رہنا چاہے وہ ان اصولوں کی مدد سے ان شاء اللہ اپنے آپ کو خطرات سے بھی محفوظ رکھے گا اور فہمِ حدیث کی راہ کو اپنے لیے ہموار بھی کرے گا۔

یہ رہنما اصول پانچ ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

قرآن مجید ہی امتیاز کی کسوٹی ہے:

پہلا اصول یہ ہے کہ قرآن مجید جس طرح ہماری زندگی کے ہر گوشہ میں حق و باطل میں امتیاز کے لیے کسوٹی ہے اسی طرح حدیث کے معاملے میں بھی اصلاً وہی امتیاز کی کسوٹی ہے۔ قرآن اور حدیث و سنّت کا باہمی تعلق، کے زیرِ عنوان اپنے مضمون میں ہم تفصیل سے واضح کر چکے ہیں کہ ان دونوں میں رشتہ اصل یا فرع یا متن اور شرح کا ہے۔ قرآن مجید میں دین و شریعت کے اصول بیان ہوئے ہیں جن کی حیثیت اساسات کی ہے اور حدیث ان کی شرح کرتی ہے۔

قرآن مجید کے جہاں اور صفاتی نام ہیں وہاں اس کا ایک نام 'المیزان' یعنی میزانِ عدل بھی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے امتوں کے باہمی اختلافات کو رفع کرنے اور حق و باطل کو ممیز کر دینے کے لیے اتارا ہے۔ یہی مقصد اللہ کی کتاب کا سب سے بڑا مقصد ہے اس لیے کہ یہی قول کر بتاتی ہے کہ کس کے ساتھ کتنا حق ہے اور اس میں کتنا غیر مطلوب اضافہ ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ — اللہ ہی ہے جس نے اتاری کتاب قولِ فیصل کے

وَالْمِيْزَانَ ۭ

ساتھ اور میزان اتاری ۔

(الشوریٰ - ۴۲ : ۱۷)

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ

بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں ۔

(الحدید - ۵۷ : ۲۵)

قرآن مجید کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کا ایک نام "مھیمن" بھی ہے جس کے معنی کسوٹی کے ہیں ۔ عدل اور قسط کو قائم کرنے کے لیے میزان اور کسوٹی کا ہونا ضروری ہے ۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی یہ دونوں صفتیں واضح فرمائی ہیں ۔ چنانچہ ارشاد ہے :

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ عَمَّا جَاۗءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ

اور ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری حق کے ساتھ، پیشتر سے موجود کتاب کی مصداق اور کسوٹی بنا کر، تو ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا اور اس حق سے ہٹ کر، جو تمہارے پاس آ چکا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔

(المآئدۃ - ۵ : ۴۸)

اس سے واضح ہوا کہ دین و شریعت کی ہر چیز کو قرآن مجید کی ترازو میں تولنا اور اس کسوٹی پر پرکھنا ہوگا۔ یہ ایک عام کلیہ ہے ۔ یہاں تک کہ اگر کسی حدیث کے باب میں بھی تردد ہوگا تو وہ بھی اسی ترازو میں تولی جائے گی ۔ اس کے لیے کوئی الگ کسوٹی نہیں ہے ۔ قرآن بہرحال ہر چیز پر حاکم ہے ۔

اگر کوئی حدیث کو قرآن کی کسوٹی سے بالاتر خیال کر کے اس کو بجائے خود میزان قرار دے بیٹھے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ تعلیماتِ قرآن کے صریحاً خلاف روایات کو بھی دین سمجھ کر اختیار کرے گا اور اس طرح اس چیز کو بھی دین بنا دے گا جو دین نہیں ہے ۔

قرآن کی کسوٹی پر پوری نہ اترنے والی ہر روایت یا تو موضوع ہے یا ہم تک صحیح حالت میں منتقل نہیں ہوئی۔ اس وجہ سے اس سے دین کو محفوظ رکھنا ضروری ہے ۔ یہ بات عقلاً اور شرعاً بالکل محال ہے کہ رسول کی کوئی بات اللہ تعالیٰ کی بات کے خلاف ہو ۔ چنانچہ اس اصول پر اہلِ فن کا اتفاق رہا ہے کہ جو حدیث قرآن کے خلاف ہوگی وہ منکر ہے اس باب میں

فنِ حدیث کے عظیم خادم، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد، فضل بن زیاد کے حوالے سے، ملاحظہ ہو :

قال : سمعت احمد بن حنبل و سئل عن الحدیث الذی روی: ان السنة قاضية على الكتاب. قال : ما اجسر على هذا ان اقوله ولكن السنة تفسر الكتاب وتعرف الكتاب و تبينه[1]۔

وہ کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے سنا اور ان سے سوال کیا گیا تھا اس قول (حدیث) کے بارے میں جس کی روایت ہوئی کہ "السنة قاضية على الكتاب" (سنت کتاب اللہ پر حاکم ہے) تو انھوں نے فرمایا کہ میں یہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ سنت تو قرآن کی تفسیر کرتی ہے، اس کی تعریف کرتی اور اس کی مجمل باتوں کی وضاحت کرتی ہے۔

چنانچہ یہ سوال ہی بالکل خارج از بحث ہے کہ کوئی حدیث قرآن کی ناسخ ہو سکے ۔ حدیث کی حیثیت مسلّم ہے، لیکن اس کے قرآن پر حاکم ہونے کا دعویٰ باطل ہے ۔

ہر حدیث، احادیث کے مجموعی نظام کا ایک جزو ہے :

قرآن مجید کی طرح احادیث کا بھی اپنا ایک مجموعی نظام ہے جس سے ہٹ کر نہ تو کسی حدیث کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس کی تاویل و توجیہ ٹھیک طور پر ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ اس سلسلے کا دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر حدیث احادیث کے مجموعی نظام کا ایک جزو سمجھی جائے گی ۔ جزو کے لیے اپنے مجموعی نظام سے پوری طرح ہم آہنگ ہونا ضروری ہے ۔ اگر کوئی حدیث اپنے مجموعی نظام سے بے جوڑ ہوگی تو وہ رد کر دی جائے گی ۔ مختلف احادیث میں تناقض کی صورت میں احادیث کا یہ مجموعی نظام ہی ہماری رہنمائی کرے گا۔

اس قسم کی بے جوڑ باتوں کی مثالیں صوفیوں کے اقوال میں بہت ملتی ہیں ۔ بعض اقوال کو وہ حدیث کے نام سے پیش کرتے ہیں درآنحالیکہ نہ وہ قرآن کے اصولوں کے مطابق ہوتے ہیں نہ حدیث کے معروفات کے ۔ اس طرح کی بعض چیزیں ، اگرچہ ان کی تعداد بہت قلیل ہے ، امہاتِ کتبِ حدیث میں بھی گھس آئی ہیں ۔ ان کو متمیز کرنا اور ان پر نگاہ رکھنا ضروری ہے ۔

حدیث کی اصل زبان عربی ہے :

تیسرا اصول یہ ہے کہ حدیث کی اصل زبان ٹکسالی عربی ہے ۔ اگرچہ احادیث کی روایت ، قرآن کے برعکس

[1] كتاب الكفاية فى علم الرواية . باب تخصيص السنن لعموم محكم القرآن و ذكر الحاجة فى المجمل الى التفسير والبيان

بیشتر بالمعنیٰ ہوئی ہے تاہم صحیح احادیث کی زبان کا ایک خاص معیار ہے جو بہت اعلیٰ ہے۔ احادیث کی زبان دوسری چیزوں کی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ احادیث پر غور کرتے ہوئے اس معیار کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ احادیث کے مجموعے مدوّن و مرتب ہوگئے اور عہدِ روایت کے ایک خاص دور تک کی زبان ان میں محفوظ ہوگئی۔ بعد کے ادوار کی زبان بہرحال مختلف ہوتی جاتی ہے۔ ہر باب میں ان احادیث کو مقدم رکھنا چاہیے جو زبان کے اعتبار سے عہدِ نبوت و صحابہ کی زبان سے ہم آہنگ ہوں۔

حدیث کی لغوی و نحوی مشکلات کے حل میں ان فنون کے ماہرین ہی کی آراء معتبر سمجھی جائیں گی۔ زبان کی باریکیوں کے معاملہ میں مسلّم لغویوں اور نحویوں کا مقام بہرحال ارفع و اعلیٰ تسلیم کرنا ہوگا اور تحقیق کے دوران میں ان کی تعبیر اور رائے اوفق سمجھی جائے گی۔

حدیث کے طالب علم کے لیے نہ صرف عہدِ نبوت و صحابہ کی زبان کی مہارت ضروری ہے، بلکہ اسے اس ذوق کی بھی مناسب تربیت فراہم کرنا ہوگی جس سے وہ اس زبان کو بعد کے ادوار کی زبان سے ممتاز کر سکے۔ اگر یہ چیز کسی کو حاصل نہ ہوگی تو اندیشہ ہے کہ وہ 'الشیخ والشیخۃ ...... الخ' کو قرآن کی ایک آیت باور کر لے گا حالانکہ قرآن کی ایک آیت تو درکنار اس کو ایک صاحبِ ذوق کے لیے حدیث ماننا بھی مشکل ہے۔ اس کی زبان بالکل عجمی فقہاء کی زبان ہے۔

کلام کے عموم وخصوص، موقع ومحل اور خطاب کا فہم ضروری ہے:

چوتھا اصول یہ ہے کہ قرآن کی طرح حدیث کے فہم میں بھی کلام کے عموم و خصوص، اس کے موقع و محل اور اس کے خطاب کو سمجھنا ضروری ہے۔

عموم و خصوص کے تحت، احادیث پر غور و فکر کے دوران میں یہ سمجھنا ضروری ہوگا کہ کہاں بظاہر کلام عام ہے، لیکن اس سے مراد خاص ہے علیٰ ہذا القیاس کہاں بظاہر کلام خاص ہے لیکن اس سے مراد عام ہے۔ ہمارے علمائے فن اس پر بحث کرتے ہیں لیکن ہے یہ چیز مشکل۔ اسی طرح فہمِ حدیث کے لیے کلام کے موقع و محل کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا بڑا اہم ہے۔ اس کے ادراک میں اگر چوک ہو جائے تو بڑے پیچیدہ سوالات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور لاطائل بحثیں چھڑ جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر 'الائمۃ من قریش' (خلفاء قریش میں سے ہوں گے) والی مشہور روایت ہے۔ اس کے موقع و محل کو سمجھنے میں صدرِ اوّل کے بعد کے دور کے بیشتر اصحابِ علم نے شدید غلطی کی ہے۔ وہ حدیث کے ظاہر الفاظ سے اس مغالطے میں مبتلا ہو گئے کہ مسلمانوں میں خلفاء صرف قریش میں سے ہوں گے۔ حالانکہ اگر اس کلیے کو مان لیا جائے تو اسلام اور برہمنیت میں کم از کم

سیاسی نظام کے حد تک کوئی فرق نہیں رہ جائے گا جب کہ اسلام نے اس برہمنیت سے سیاسی نظام کو سب سے پہلے پاک کیا۔

اس مغالطے کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کا موقع و محل ٹھیک طرح سے نہیں سمجھا گیا۔ یہ حدیث ہمیشہ کے لیے قریش کی سیاسی برتری کے بیان کے لیے نہیں آئی ہے، بلکہ اس نزاع کے فیصلہ کے لیے آئی ہے جو اس وقت انصار کے ایک گروہ کے ذہن میں موجود تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملت کی قیادت کے حق دار، اپنی دینی خدمات کی بنا پر وہ ہیں نہ کہ قریش۔ اگرچہ نزاع صرف ایک گروہ کے ذہن تک محدود تھی، لیکن اس کے اثرات وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہتے تھے۔ اندیشہ تھا کہ آپ کے بعد یہ کسی بڑے فتنہ کی صورت نہ اختیار کر لے اس وجہ سے حضورؐ نے اپنی حیاتِ مبارک میں یہ فیصلہ فرما دیا کہ اُس دور کے عرب قریش کے علاوہ کسی اور کی قیادت و سیادت تسلیم نہیں کریں گے۔ لہٰذا مسلمانوں کے امراء قریش میں سے ہوں۔ آپ کے اس فیصلے نے اس نزاع کے طے کرنے میں بڑی مدد دی جو آپ کی وفات کے بعد انصار و مہاجرین کے درمیان سقیفہ بنی ساعدہ میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ حضورؐ کے اس فیصلہ کی نوعیت ایک وقتی نزاع کے فیصلہ کی تھی اور اس کی بنیاد قریش کی موجود الوقت سیاسی برتری پر تھی، نہ کہ ہمیشہ کے لیے خاندانی فضیلت پر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا موقع و محل نہ سمجھنے سے جس قسم کی گمراہیاں پیدا ہوئیں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اسی کو سامنے رکھ کر عصرِ حاضر کی ایک جماعت کے امیر صاحب نے یہ فتویٰ دے ڈالا کہ اگر اسلام کا کوئی حکم حکمتِ عملی کے تقاضوں کے منافی نظر آئے تو امیرِ جماعت اس کو تبدیل کر سکتا ہے۔ اس کی دلیل انھوں نے یہ دی کہ اگرچہ مساوات اسلام میں ایک مسلّم ضابطہ ہے، لیکن خلافت کے معاملہ میں حضورؐ نے اس کو حکمتِ عملی کے منافی پایا اس وجہ سے 'الائمۃ من قریش' کا اعلان کر کے اس ضابطہ کو منسوخ کر دیا۔

ایک اور مثال لیجیے۔ بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ 'اُمِرتُ ان اقاتل الناس حتی یقولوا: لا الٰہ الا اللّٰہ' (مجھے حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ 'لا الٰہ الا اللّٰہ' کا اقرار کرلیں)۔ اگر اس روایت کو اس کے ظاہر معنیٰ میں لیجیے اور صحیح موقع و محل نہ سمجھیے تب تو مستشرقین کا یہ کہنا صحیح ثابت ہو جائے گا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا اور آپؐ کی یہ جنگ اس وقت تک جاری رہنی ہے جب تک کہ تمام بنی آدم 'لا الٰہ الا اللّٰہ' نہ پکار اٹھیں، لیکن یہ معنی بالبداہت غلط معلوم ہوتے ہیں کیونکہ واقعات اس کے خلاف ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ کتاب اور مجوس سے جزیہ لیا اور ان سے 'لا الٰہ الا اللّٰہ' نہیں کہلوایا۔ اسی طرح تمام معاہدِ اہلِ صلح بھی برابر اپنے دین پر قائم رہے، ان میں سے کسی کو اسلام

پر مجبور نہیں کیا گیا۔ لہٰذا یہ متعین کرنا پڑے گا کہ اس حدیث کا کیا مفہوم ہے۔ اگر آپ حدیث کے لفظ 'الناس' کے عموم کو بنی اسماعیل کے لیے خاص مان لیں، جس کا واضح قرینہ موجود ہے، تو حدیث قرآن مجید کے بالکل مطابق ہو جاتی ہے۔ ہم دوسری جگہ یہ سنت اللہ بیان کر چکے ہیں کہ جس قوم کی طرف رسول کی براہ راست بعثت ہوتی ہے وہ قوم اگر ایمان نہ لائے تو کامل اتمام حجت کے بعد یا تو خدا کے عذاب سے فنا کر دی جاتی ہے، یا اہل ایمان کی تلوار سے ختم ہو جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مذکورہ قول میں واضح فرمایا ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ بنی اسماعیل کی طرف آپؐ کی بعثت براہ راست تھی۔ اس وجہ سے اتمام حجت کے بعد ان کے لیے دو ہی راستے باقی رہے: اسلام یا تلوار۔ وہ نہ غلام بنائے گئے، نہ ان سے جزیہ قبول کیا گیا۔

ذخیرۂ حدیث میں اس نوع کی روایات بہت ہیں اور ان کے موضوعات بھی بڑے اہم ہیں۔ ان پر غور و فکر کے دوران میں یہ سمجھنا پڑتا ہے کہ یہاں موقع کلام کیا ہے۔ اسی موقع کلام کو نہ سمجھنے کی بدولت ہمارے بیشتر علماء حضرات الجھنوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ جرأت کے ساتھ کلام نہیں کرتے، یا تو معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہیں، یا غلط فتوے دیتے ہیں۔

دین اور عقل و فطرت میں منافات نہیں ہے:

اس سلسلے کا پانچواں اور آخری اصول یہ ہے کہ دین اور عقل و فطرت میں منافات ہرگز نہیں ہے۔ ان میں منافات ممکن ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دین کو عقل و فطرت ہی کے اوپر مبنی کیا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ط	اس دینِ فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔

(الروم - ۳۰ : ۳۰)

عقل و فطرت ہی کے تقاضے ہیں جن کو دین اجاگر کرتا، ان کو اصول کی شکل دیتا اور ان پر زندگی کے سارے نظام کو کھڑا کرتا ہے۔ ان میں منافات کیسے ہو سکتی ہے؟ اس لیے ہر وہ چیز جو عقل و فطرت کے منافی ہوگی وہ دین کے بھی منافی ہوگی۔

جس طرح قرآن کی تمام دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے اور وہ اپنے دعاوی کے اثبات کے لیے عقل و فطرت کو شہادت میں پیش کرتا ہے اسی طرح حدیث کے دل میں اترنے کا اصل راستہ بھی عقل و فطرت ہی ہے۔ اس وجہ سے حدیث میں کوئی بات عقل کے صریح خلاف نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی بات صریحاً عقل کے منافی نظر آئے تو اس پر اچھی طرح غور کیجیے، یہاں تک کہ یا تو اپنی غلطی واضح ہو جائے یا حدیث کا ضعف

سمجھ میں آجائے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ کسی حقیقت کا عقل کے منافی ہونا اور چیز ہے اور اس کے تمام اطراف کا گرفت میں نہ آنا اور چیز ہے۔ اگر نوعیت یہ ہے کہ بات سمجھ میں نہیں آئی اور یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ کیوں سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل کی رسائی محدود ہے۔ لیکن اگر وہ عقل کے منافی نہیں ہے تو اس پر برابر غور کرتے رہیے، یہاں تک کہ وہ بات سمجھ میں آجائے یا یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو کر سامنے آجائے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اگر یہ بات عیاں ہو جائے کہ اس میں اور عقل و فطرت میں منافات پائی جاتی ہے اور غور و فکر کے باوجود کسی طرح اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی تو یہ رد کرنے کے قابل ہے۔

یہاں یہ بات سامنے رکھنے کی ہے کہ جو لوگ عقل سے صحیح طور پر کام نہیں لیتے، یا اپنی عقل کو اپنی خواہشات کی لونڈی بنانا چاہتے ہیں، وہ لوگ یہاں زیر بحث نہیں ہیں۔ ان کو اللہ کے حوالہ کیجیے۔

خلاصۂ بحث:

دین و شریعت کا معاملہ بڑا نازک اور حساس معاملہ ہے۔ احادیثِ رسول کو دین کا درجہ حاصل ہے۔ کسی روایت کو حتمی طور پر حدیثِ رسول قرار دینا بڑی بھاری ذمہ داری کا کام ہے۔ ہر شخص اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔ تدبرِ حدیث کے ضمن میں نقدِ حدیث کے جہاں اور اصول ضروری اور مفید ہیں وہاں مذکورہ بالا پانچ اصول بنیادی رہنمائی کے لیے کلیدی اہمیت کے حامل ہیں اور وہ غور و فکر کے لیے اساس کا کام دے سکتے ہیں۔ حدیث کے طالب علم کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کی رہنمائی کے بغیر وہ فہم حدیث کے جملہ تقاضے پورے کر سکے۔

(ترتیب: ماجد خاور)

حکمتِ قرآن

امین احسن اصلاحی

خیر و شر کا مسئلہ

فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں

انسان نے جب سے زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش شروع کی ہے اسی وقت سے یہ مسئلہ بھی اس کے غور و فکر کا موضوع بنا ہوا ہے کہ انسان کے لیے خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ ہر زمانے کے فلسفیوں نے اس پر رائے زنی کر کے خیر و شر کو متعین کرنے کی کوشش کی اور ہر دور میں یہ گمان کیا کہ اس مسئلہ کو انھوں نے حل کر لیا ہے لیکن بعد میں آنے والوں نے ان کی رائے پر جرح کر کے بتایا کہ ان کی تقریر کچھ زیادہ دل نشیں نہ تھی اور مسئلہ کے کئی پہلو حل طلب باقی رہ گئے۔ چنانچہ زمانہ قبل مسیح سے لے کر عصرِ جدید تک زیرِ بحث رہنے کے باوجود اہلِ فلسفہ کے ہاں خیر و شر کے تعین کا بنیادی سوال باقی ہے۔ اہلِ مذہب نے بھی اس عقدہ کو حل کرنا چاہا لیکن انھوں نے مسئلہ کو مزید الجھا دیا۔ قرآن مجید اس موضوع پر ایک خاص نقطہ نظر پیش کرتا ہے اور ان تمام سوالوں کا جواب دیتا ہے جو اب تک اہلِ فلسفہ یا اہلِ مذہب کو پریشان رکھتے رہے ہیں۔

بنیادی طور پر یہ سوالات چار ہیں :

(ا) کیا خیر اور شر دو الگ الگ، مستقل اور ممتاز چیزیں ہیں یا دونوں کا وجود محض اضافی اور نسبتی ہے؟ یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کو عقل و فطرت کی رہنمائی یا آسمانی صحیفوں کی تعلیمات کے ذریعے متعین طور پر بتا دیا گیا ہو کہ فلاں چیز خیر اور فلاں چیز شر ہے یا حالات ایک ہی چیز کو کبھی خیر بنا دیتے ہوں کبھی شر۔ گویا زمانہ زمانہ کے لحاظ سے خیر و شر کا معیار بدل جاتا ہو، اسی طرح ایک چیز مجموعہ میں خیر نظر آتی ہو لیکن انفرادی طور پر شر کی حیثیت سے نمایاں ہوتی ہو۔ جیسے نغمہ کے زیر و بم مجموعہ میں دونوں اچھے لگتے ہیں لیکن الگ الگ کر دیجیے تو ان کی آواز کانوں کو ناگوار محسوس ہوتی ہے۔

(ب) کیا خیر و شر کا تصور انسان کی فطرت میں لکھا ہوا ہے یعنی یہ تصور (INBORN INNATE) ہے۔

اگر ایسا نہیں ہے اور اگر آسمانی صحیفوں میں بھی اس کو متعین نہیں کیا گیا تو پھر یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔ اس کا جواب اگر یہ دیا جائے کہ اس صورت میں عقل کے سوا کوئی چیز رہنما نہیں ہو سکتی تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا عقل نے ایسے کچھ معیار اور کسوٹیاں متعین کی ہیں جن پر پرکھ کر معلوم کیا جا سکے کہ یہ چیز اچھی ہے اور یہ چیز بری ہے۔

(ج) اگر خیر و شر دونوں الگ الگ اپنا وجود رکھتے ہیں تو کیا دونوں کا خالق ایک ہی ہے یا شر کا خالق کوئی اور ہے اور خیر کا خالق کوئی دوسرا ہے۔ اگر دونوں کے خالق الگ الگ ہیں تو کائنات میں ثنویت پیدا ہوتی ہے۔ اس صورت میں یزداں اور اہرمن دونوں ماننے جائیں گے۔ لیکن اگر دونوں کا خالق ایک ہی ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خالق کائنات کو تو خیر مطلق ہونا چاہیے وہ شر کا خالق کیسے۔ ہوگا فرشتوں کو اس نے بنایا تو ٹھیک بنایا لیکن اگر ابلیس کو بھی اسی نے بنایا ہے تو مسئلہ نازک ہو جاتا ہے۔ ثنویت ماننے کی شکل میں توحید کا دعویٰ بے جوڑ ہو جاتا ہے۔

(د) اگر خیر و شر دونوں کا علم فطری ہے تو اس سلسلہ میں قوموں، ملتوں، گروہوں اور افراد کے درمیان اختلافات کیوں ہیں؟ فطری چیز کا تقاضا تو یہ تھا کہ سب متحد ہوتے لیکن اس میں تو قدم قدم پر اختلافات ہیں۔

ان سوالات پر ہر زمانہ کے دانشوروں، حکیموں اور فلسفیوں نے غور و فکر کرنے کے بعد جو رائے ظاہر کی ہے ہم آئندہ صفحات میں اس کا جائزہ لیں گے اور اختصار کی خاطر صرف ان فلسفیوں کا ذکر کریں گے جنھوں نے فکر و فلسفہ پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اس کے بعد ہم یہ بتائیں گے کہ اس سلسلہ میں قرآن مجید نے کیا رہنمائی دی ہے۔

اہلِ فلسفہ کی آراء

ہیراقلیطس :

یونان کے فلسفی ہیراقلیطس (HERA CLITUS) (۵۳۵ —— ۴۷۵ ق۔م) کے خیال میں خیر و شر کی مثال نغمہ کے زیر و بم کی ہے گانے میں کچھ اونچے سر اور کچھ نیچے سر ہوتے ہیں اور یہ دونوں مل کر اچھی موسیقی پیدا کرتے ہیں، اسی طرح اچھائی اور برائی دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ یہ دونوں مل کر دنیا میں حسن پیدا کرتی ہیں۔ برف ٹھوس ہے لیکن وہ پگھل کر پانی بن جاتی ہے جو نرم ہے۔ اس حقیقت سے ہیراقلیطس نے یہ نتیجہ نکالا کہ دنیا میں تضادات کا وجود محض ظاہری ہے، کائنات میں توافق اور سازگاری خیر و شر سے مل

کر پیدا ہوتی ہے۔ اس کے خیال میں ہم تو اچھائی اور برائی کو الگ الگ دیکھتے ہیں لیکن خدا کی نظر ان دونوں کے ملنے سے پیدا ہونے والی سازگاری اور توافق پر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یونان کے قدیم فلسفیوں کی طرح ہراقلیطس بھی برائی کو برائی نہیں سمجھتا بلکہ وہ اس کو ایک اور قسم کی اچھائی سمجھتا ہے جو اگر نہ ہو تو اس کائنات کا حسن اور اس کی رنگینی اور بوقلمونی غارت ہو جائے گی۔

ڈیموکریٹس :

ڈیموکریٹس (DEMOCRITUS) (۴۶۰ ——— ۳۷۰ ق۔م) کے نزدیک زندگی کا مقصد مسرت کا حصول ہے اس لیے جس چیز سے انسان کو خوشی حاصل ہو وہ اچھی ہے اور جس سے یہ مقصد حاصل نہ ہو وہ بری ہے۔ البتہ وہ ظاہری مسرت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ اندرونی کیفیت اور داخلی سکون اور طمانیت کو حقیقی مسرت کا نام دیتا ہے اسی لیے وہ کہتا ہے کہ انسان کو دنیاوی چیزوں پر تکیہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ تو آنی جانی چیزیں ہیں جن میں سے کسی بھی چیز سے محرومی انسان کو مسرت سے محروم کر دیتی ہے اس لیے حقیقی مسرت انسان کی اندرونی کیفیت اور متوازن زندگی کا نام ہونا چاہیے۔

مزید برآں ڈیموکریٹس کے نزدیک نیکی عمل کا نام نہیں بلکہ نیک کام کرنے کی خواہش کا نام ہے اس لیے نیک کام کرنے والا آدمی نیک نہیں ہو سکتا بلکہ وہی انسان نیک ہے جو ہر وقت نیک کام کرنے کی خواہش رکھتا ہو۔

سوفسطائی فلاسفہ :

سوفسطائی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے فلسفیوں (SOPHISTS) نے خیر و شر کے مسئلہ کو بہت الجھا دیا ہے۔ اس مکتبِ فکر کے نہایت اہم فلسفی فیثاغورث (PYTHA GORAS) (۵۸۰ ——— ۵۰۰ ق م) کا کہنا ہے کہ چونکہ انسان ہی تمام چیزوں کا معیار ہے اس لیے اچھائی اور برائی کا پیمانہ بھی وہ خود ہی ہے۔ چونکہ ہر انسان الگ الگ خیر و شر کا اپنا معیار رکھتا ہے اس لیے وہ بحیثیت مجموعی نہیں بلکہ خود ہی یہ فیصلہ کرنے کا مجاز ہے کہ اس کے لیے خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟

اس مکتبِ فکر کے بعض فلسفیوں ایتھی ڈیمس (EUTHY DEMUS) تھریسائی ماکس (THRASY MACHUS) کالی کلیز (CALLICLES) نے ایک اور قدم آگے بڑھا کر کہا کہ اخلاقی قوانین اور ہمہ گیر اخلاقی اصولوں کا کوئی وجود نہیں۔ اخلاقیات محض رسوم و رواج اور عادات کا نام ہے۔

لہٰذا انسان زندگی گزارنے کے کسی اخلاقی ضابطہ کا پابند نہیں بلکہ وہ اس معاملہ میں بالکل آزاد ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے اور اپنے لیے خیر و شر کا جو پیمانہ چاہے مقرر کرے۔

اس نقطۂ نظر کا نتیجہ اخلاقی انتشار، انفرادیت پسندی اور خود غرضی کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے۔ اسی لیے کالی کلیز کا کہنا ہے "اخلاق کو بھاڑ میں جھونکو، یہ چیز تو کمزوروں نے طاقت وروں کی طاقت کو دفع کرنے کے لیے وضع کی ہے"۔

سقراط :

یونان کے عظیم فلسفی سقراط (SOCRATES) (۴۷۰ ق م ——— ۳۹۹ ق م) کے نزدیک انسان کے لیے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے اور اس کی کسوٹی اور معیار کیا ہے؟ اس سوال کا جواب خود اس نے یہ دیا ہے کہ خیر و شر کا تصور اور اس کا معیار انسان کے اندر ہی موجود ہے اگر وہ غور و فکر کی عادت ڈال لے تو اپنی فطرت کی رہنمائی سے خیر و شر کا تعین کر سکتا ہے۔ اس کا مشہور و معلوم مقولہ "اے انسان! اپنے کو پہچان" بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خیر و شر کے بنیادی اصول انسان کے اندر موجود ہیں جو غور و فکر کے بعد معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ سقراط بار بار یہ سوال اٹھاتا ہے کہ اچھائی اور برائی، صحیح اور غلط کو ناپنے کا کوئی پیمانہ اور اس کے بنیادی اصول ضرور ہونے چاہئیں اور وہ انسان کی ذاتی خواہشات اور اعتقادات سے بلند ہونے چاہئیں۔

اس کے نزدیک سب سے بڑا خیر (GREATEST GOOD) علم ہے اور علم کا خزانہ انسان کے اندر مدفون ہے جس کو غور و فکر کے بعد دریافت کیا جا سکتا ہے۔ سقراط خود شناسی کو جو اہمیت دیتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کے نزدیک یہی حقیقی علم ہے جس کی انسان خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ دوسرا تمام علم مستعار ہوتا ہے جس کا انسان پر گہرا نقش نہیں ہوتا۔ خود شناسی سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ حقیقی مسرت کا باعث بنتا ہے۔ مسرت کے دوسرے معیار اصلی اور حقیقی نہیں۔ سقراط کے نزدیک خود شناسی کے بعد اگر کوئی شخص علم حقیقی کی مخالفت کرتا ہے تو یہ ایک وقتی بات ہوتی ہے جس طرح ایک خوش ذوق آدمی کا پاؤں کبھی گندگی میں پڑ جاتا ہے تو وہ وہاں ڈیرہ نہیں ڈال دیتا بلکہ اس مصیبت سے فوراً جان چھڑا لیتا ہے۔ سقراط کا خیال ہے کہ کوئی شخص اپنی مرضی سے برا نہیں بنتا، وہ برا اس لیے بن جاتا ہے کہ اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ اچھائی کیا ہے اور برائی کیا ہے اس لیے اگر اس پر واضح ہو جائے کہ نیکی کیا ہے تو وہ بھلائی کا راستہ اختیار کرے گا۔

افلاطون :

افلاطون (PLATO) (۴۲۸ ق م —— ۳۴۸/۳۴۷ ق م) کا کہنا ہے کہ عالم محسوسات یعنی دنیا میں آنے سے پہلے انسان کو تمام خیر و شر سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اس کے اندر مرقوم ہے۔ دنیا میں آنے میں جو عرصہ گزرا اس میں انسان بعض باتوں کو بھول گیا۔ ان بھولی ہوئی باتوں کو کسی مذکر کی تذکیر یا قدرت کا وجدان یاد دلا دیتا ہے اور تجربات بھی انسان کو یاد دہانی کرتے رہتے ہیں۔ خیر و شر کی تمام باتیں انسان کے اندر (INNATE / INBORN) موجود ہیں اور اس کی فطرت میں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کے نزدیک انسان کی حقیقی سعادت اس کی عقل اور اس کا اخلاق ہے۔ نیکی بذات خود ایک سعادت اور روح کی زینت ہے اور یہ خود ہی اپنا اجر بھی ہے۔

ارسطو :

ارسطو (ARISTOTLE) (۳۸۴ ق.م —— ۳۲۲ ق.م) کے نزدیک عقل بہت بڑی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے اس کے اندر نور یزدانی (DIVINE SPARK) بھی موجود ہے۔ اس لیے اگر انسان اپنی تمام صلاحیتوں اور اپنی عقل کو صحیح طریقہ پر مرتب کرے تو اس کو خود آگاہی کا مقام حاصل ہو جاتا ہے جس کے بعد انسان کو خیر و شر کے لیے کسی کسوٹی کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ خود آگاہی کا یہ مقام اس کی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ارسطو بھی انسانی عقل اور فطرت کو رہنمائی کے لیے کافی سمجھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ نیکی ہماری فطرت کے موافق اور عقل کے مقرر کردہ اصول کے مطابق ہے، جس کا تعین ایک دانا شخص آسانی سے کر سکتا ہے۔

ابیقوری اور رواقی فلاسفہ :

ابیقوریوں (EPICUREANS) کے نزدیک انسان کی تمام سرگرمیوں کا مقصد مسرت کا حصول ہے اس لیے سب سے بڑی اچھائی مسرت ہی ہے لیکن نگاہ فوری نتائج کی بجائے حتمی نتائج پر ہونی چاہیے۔ جس طرح ایک پُرتکلف کھانا مزا تو بہت دیتا ہے لیکن اگر زیادہ کھا لیا جائے تو تکلیف بھی بہت دیتا ہے اس لیے وقتی تلذذ کو مسرت قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کا آخری نتیجہ برا ہوتا ہے۔ اس مکتب فکر کے بانی ابیقورس (EPICURUS) (۳۴۱ ق.م —— ۲۷۰ ق.م) کا کہنا ہے کہ جسمانی تلذذ نہیں بلکہ ذہنی مسرت حقیقی

مسرت ہے اس لیے مسرت کی تلاش ذہنی اور فکری میدان میں ہونی چاہیے۔

رواقیوں (STOICS) کا کہنا ہے کہ انسان چونکہ اس کائنات کا ایک حصہ ہے اس لیے اس کو فطرت کے قوانین کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے اور یہی خیر اعلیٰ (GREATEST GOOD) ہے۔

فیلو :

ابتدائی دور میں مذہب کے نام پر جو تحریکیں اٹھیں جن میں بابل اور اشوریہ کی تحریکیں قابل ذکر ہیں ان کے محرکین نے خدا کو خیر مجسم اور مادہ کو شر قرار دیا جن کی کش مکش سے دنیا میں نیکی اور بدی کا ظہور ہوتا ہے۔ فیلو (PHILO) (۳۰ ق.م —— ۵۰ء) کا کہنا ہے کہ خدا تمام خیر کا سرچشمہ اور مادہ تمام برائیوں کی جڑ ہے، اس لیے انسان کا روحانی وجود، جو عقل اور روح سے مرکب ہے، نیکی کا معیار ہے اور اس کا جسم جو مادہ سے بنا ہوا ہے، برائی کا ذریعہ ہے۔ اس لیے جب روح مادہ کے اندر ڈالی گئی تو وہ خیر مجسم نہیں رہی کیونکہ مادہ اس کو برائی کی طرف کھینچتا ہے۔ پس انسان کو برائیوں سے بچنے کے لیے مادہ سے نجات حاصل کرنی چاہیے تاکہ وہ خیر مجسم یعنی خدا کی طرف لوٹ سکے۔

سینٹ آگسٹائن :

عیسائی متکلمین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ خدا نے انسان کو نیک بنایا لیکن وہ اپنے مادی جسم کی گمراہیوں میں گم ہو کر خدا سے دور ہو گیا ہے۔ آدم کا گناہ اس کے ساتھ اس طرح چپک گیا ہے کہ وہ اس کی جکڑ بند سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہ گناہ ساری زندگی اس کا تعاقب کرتا رہتا ہے الا یہ کہ خدا کا فضل اس کے شامل حال ہو اور وہ اس کو نجات دے دے۔ نجات کے اس مقصد کے لیے انہوں نے رہبانیت کا فلسفہ ایجاد کیا اور انتہائی جانگسل ریاضتیں ایجاد کیں تاکہ مادی جسم کو اذیتیں دے کر آدم کے گناہ سے نجات حاصل کی جاسکے۔ عیسائی متکلمین کے سب سے بڑے اور ذہین ترین نمائندے سینٹ آگسٹائن (SAINT AUGUSTINE) (۳۵۴ء - ۴۳۰ء) کا کہنا ہے کہ خدا خیر ہی خیر ہے لہٰذا وہ شر کا خالق نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں شر کا وجود کیوں ہے؟ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے سینٹ آگسٹائن نے کہا کہ دنیا میں کوئی چیز بری نہیں ہے جو چیز بری نظر آتی ہے وہ درحقیقت بری نہیں، یہ صرف دیکھنے اور سمجھنے کا قصور ہے یعنی ؎

گل ہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن

ان رنگ رنگ کے پھولوں میں ہر ایک اپنی جگہ اچھا ہے اور چمن کی خوب صورتی میں اضافہ کرتا ہے۔

اس کی مثال اس نے مصوری سے دی کہ جس طرح تصویر میں سیاہ دھبے اور دوسرے مختلف رنگوں کے دھبے ہوتے ہیں جو تصویر میں نکھار پیدا کرتے ہیں اور ایک دل کش اور خوب صورت تصویر مختلف رنگوں سے مل کر بنتی ہے۔ اسی طرح دنیا میں جو برائی نظر آتی ہے وہ اس کی رنگینی کے لیے ضروری ہے۔ ہمیں وہ برائی اس لیے نظر آتی ہے کہ ہم سیاہ دھبوں کو تصویر سے الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ اگر ان سیاہ دھبوں کو تصویر میں ان کی اصل جگہ پر رکھ کر دیکھیں تو ہمیں خالِ رخِ یار کی مانند نظر آئیں گے۔ اسی طرح اگر ہم برائی کو دنیا کے پورے نقشہ میں اس کی اصل جگہ پر فٹ کر کے دیکھیں تو وہ بھلائی اور خیر نظر آئے گی۔

پیٹر ایبی لارڈ :

قرونِ وسطیٰ کے دور کے عیسائی متکلم پیٹر ایبی لارڈ (PETER ABELARD) (۱۰۷۹ء — ۱۱۴۲ء) نے خیر و شر کے مسئلہ کو ایک نیا رنگ دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ کوئی شے فی نفسہٖ نہ اچھی ہے اور نہ بری۔ اچھائی اور برائی کا تعلق آدمی کے ارادے اور نیت سے ہے۔ اگر کوئی انسان ایک کام اچھے ارادے سے کرتا ہے تو وہ کام اچھا ہے اور اگر وہی کام وہ برے ارادہ سے کرتا ہے تو وہ برا ہے۔ یعنی اگر ایک آدمی اچھی نیت سے چوری کرتا ہے تو نیکی ہے کیونکہ خدا نفسِ فعل کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ نیت اور ارادہ کو دیکھتا ہے۔ ایبی لارڈ کے نزدیک اگر کوئی شخص نیک نیتی سے کوئی کام کرے لیکن بھٹک جائے اور گناہ کر بیٹھے تو وہ کام نیک ہی کہلائے گا۔ اس کے نزدیک اچھائی اور برائی کا معیار انسان کا ضمیر اور اس کی نیت اور ارادہ ہے۔ اصل گناہگار وہ شخص ہے جو بری نیت سے برا کام کرے۔ اچھی نیت سے برا کام کرنے والا برا نہیں۔

تھامس اکیوناس :

عیسائی متکلم تھامس اکیوناس (THOMAS AQUINAS) (۱۲۲۶ء — ۱۲۷۴ء) بھی یہی سمجھتا ہے کہ اچھائی اور برائی کا انحصار نیت اور ارادہ پر ہے لیکن وہ اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ اگر اچھی نیت سے کوئی برا کام کیا جائے تو وہ اچھا ہو جائے گا۔ اس کے نزدیک نیکی صرف وہی ہے جو اچھی نیت سے کی جائے اور اس توقع پر کی جائے کہ اس کے نتائج بھی اچھے نکلیں گے۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا نے تمام چیزوں کو نیک مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور ان میں انسان بھی شامل ہے۔ نیک مقصد کو حاصل کرنا خیرِ اعلیٰ ہے اس لیے سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ انسان یہ جانے کہ خدا نے اسے کس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان مادی دنیا کو ترک کر کے رہبانیت اختیار کرے اور کسی خانقاہ میں بیٹھ

کر خدا سے لو لگائے۔

اکیوناس کے نزدیک برائی اچھائی کی نفی ہے۔ جہاں نیکی نہیں ہے وہاں بدی ہے۔ اس لحاظ سے اس کے نزدیک بدی ایک منفی چیز ہے۔ چونکہ خدا نے تمام چیزوں کو نیک مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اس لیے جب کوئی چیز اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے تو بدی پیدا ہوتی ہے۔

مائیسٹر ایکھارٹ :

مائیسٹر ایکھارٹ (MEISTER ECKHART) (۱۲۶۰ء — ۱۳۲۷ء) نے خیر و شر کا صوفیانہ نظریہ پیش کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ اچھی اور نیک زندگی اچھے افعال اور اعمال سے نہیں بنتی بلکہ اپنی ذات کو خدا کی ذات میں فنا کر دینا اصل نیکی اور خدا کی وحدانیت سے اپنے آپ کو الگ کرنا بدی ہے۔ اس لیے انسان کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو فنا کر کے خدا کی ذات میں گم ہو جائے۔ اس لحاظ سے ایکھارٹ نے وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا۔

تھامس ہابس :

تھامس ہابس (THOMAS HOBBES) (۱۵۸۸ء — ۱۶۷۹ء) کے نزدیک خیر و شر نسبتی اور اضافی ہے۔ اس میں نہ صرف زمانہ کے ساتھ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے بلکہ ہر انسان کے نزدیک بھی اس کا معیار بدلتا رہتا ہے۔ ہابس کے نزدیک جس چیز سے انسان کو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ اچھی ہے۔ جس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے وہ بری ہے۔ اس لیے اگر ایک چیز کسی شخص کو اچھی لگتی ہے تو ضروری نہیں کہ وہی چیز دوسرے شخص کو بھی اچھی لگے۔ اس لحاظ سے کوئی چیز خیرِ مطلق یا شرِ محض نہیں ہے۔ اس کے خیر یا شر ہونے کا انحصار ایک خاص وقت پر کسی شخص کی انفرادی پسند و ناپسند پر ہے۔ وقت بدلنے کے ساتھ اس کا معیار بھی بدل سکتا ہے، اور نیکی بدی میں اور بدی نیکی میں بھی بدل سکتی ہے۔

ڈیکارٹ :

مشہور فلسفی ڈیکارٹ (DESCARTE) (۱۵۹۶ء — ۱۶۵۰ء) کا کہنا ہے کہ خدا خیرِ مطلق ہے اس لیے وہ شر کا خالق نہیں ہو سکتا البتہ اس نے انسان کو جو عقل دی ہے وہ اس کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں۔ انسان طبع کے رجحانات اور جذبات کی رو میں بہہ کر ٹھوکر کھا جاتا ہے قوتِ فیصلہ کی کمی کے باعث وہ نیکی اور بدی میں تمیز نہیں کر پاتا اور اس طرح نیکی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے غلطی سے برائی کی راہ پر چل نکلتا ہے۔ لہٰذا

خدا کا عمل شر نہیں بلکہ شر انسان سے پیدا ہوتا ہے جو ناکافی علم کے ساتھ فیصلہ اور عمل کرتا ہے۔

سپینوزا :

سپینوزا (SPINOZA) (۱۶۳۲ء — ۱۶۷۷ء) کے نزدیک خیر و شر اضافی اصطلاحات ہیں۔ خدا ہمارے خیر و شر سے ماورا ہے کیونکہ اچھائی اور برائی کا تعلق انسان سے ہوتا ہے اور وہ بھی اس کے انفرادی ذوق سے۔ کائنات میں نیکی اور بدی کی کوئی حقیقت ہے اور نہ جواز۔ اس کے نزدیک شر اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ہم بحیثیت مجموعی نظامِ فطرت کی ترتیب سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اشیاء کے متعلق ہمارا علم ناقص ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہم چاہتے ہیں کہ ہر چیز ہماری عقل کے مطالبات کے مطابق ہو جائے اور جب ایسا نہیں ہوتا تو ہمیں شر نظر آتا ہے۔ ہماری عقل جس کو شر کہتی ہے وہ فطرت کل کے نظام اور قوانین کے لحاظ سے شر نہیں بلکہ ان قوانین کے مطابق شر ہے جو ہماری فطرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح جو چیز آدمی کے تحفظ میں معین ہو وہ خیر ہے اور جو اس میں خلل پیدا کرے وہ شر ہے۔ سپینوزا کے نزدیک ایک ہی وقت میں ایک چیز اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بری بھی ہو سکتی ہے اور دونوں صفات سے مبرا بھی۔ مثال کے طور پر خوش و خرم شخص کو موسیقی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ماتم زدہ اور سوگوار کو بری لگتی ہے اور مُردوں کے لیے یہ اچھی ہے نہ بری۔ اس کے نزدیک خیر و شر اور نیک و بد تعصبات ہیں اور حقیقت ابدی کبھی انہیں تسلیم نہیں کر سکتی۔

جان لاک :

جان لاک (JOHN LOCKE) (۱۶۳۲ء — ۱۷۰۴ء) کے نزدیک خیر و شر کے تمام کلیات انسان کی فطرت میں مرقوم ہیں۔ انسان ان کو اس طرح اپنے اندر پاتا اور محسوس کرتا ہے گویا ان کلیات کو ازل سے کسی نے اس کی لوحِ قلب پر لکھ دیا ہے۔ لاک کا کہنا ہے کہ دکھ اور سکھ شروع ہی سے انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے اور قدرت نے ہمیں اس طرح بنایا ہے کہ ہم سکھ سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور دکھ سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے جن چیزوں سے ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے وہ اچھی ہیں اور جو تکلیف پہنچاتی ہیں وہ بری کہلاتی ہیں چونکہ ایک ہی فعل ہر شخص کے لیے خوشی کا باعث نہیں ہوتا اس لیے ہمیں دوسروں کو خوش رکھنے کے لیے بعض قوانین کی پابندی بھی کرنا پڑتی ہے۔ جان لاک کہتا ہے کہ ہم تجربات کے ذریعہ یہ سیکھتے ہیں کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔ جو تجربہ ہمیں دکھ دیتا ہے وہ برا ہے اور جس سے ہمیں سکھ ملتا ہے وہ اچھا ہے۔

رچرڈ کمبرلینڈ :

رچرڈ کمبرلینڈ (RICHARD CUMBERLAND) (۱۶۳۱ء — ۱۷۱۸ء) پہلا فلسفی ہے جس نے سودمندی کا نظریہ پیش کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان خود غرض نہیں بلکہ وہ معاشرہ کے دوسرے افراد کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے اس لیے معاشرہ کی فلاح و بہبود ہی وہ پیمانہ ہے جس سے خیر و شر کو ناپا جا سکتا ہے۔ اسی نقطہ نظر کی تائید لارڈ شفٹسبری (LORD SHAFTESBURY) نے کی۔

فرانسس ہچسن (FRANCIS HUTCHESUN) بھی اسی نقطہ نظر کا حامل ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت کے لیے سب سے بڑا خیر (THE GREATEST GOOD FOR THE GREATEST NUMBER) خیر و شر کی کسوٹی ہے۔

لائبنز :

لائبنز (LEIBNITZ) (۱۶۴۶ء — ۱۷۱۶ء) کی رائے میں انسان کے اندر ازل سے ایسے اصول موجود ہیں جو خیر و شر کی معرفت اور رہنمائی کے لیے کافی ہیں لیکن انسان جذبات اور خواہشات سے مغلوب ہو کر ان اصولوں کی خلاف ورزی کر بیٹھتا ہے جس سے شر پیدا ہوتا ہے۔ ان اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ خوشی کی تلاش کرو اور مصیبت سے بچو۔ اس کے نزدیک یہی وہ کسوٹی ہے جس پر پرکھ کر ہم خیر و شر کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ برائی تو اچھائی کا حسن نکھارنے کے لیے ہوتی ہے۔ جس طرح تصویر میں سیاہ دھبے دوسرے رنگوں کو ابھار دیتے ہیں اسی طرح بدی نیکی کے ساتھ مل کر دنیا میں رنگینی پیدا کرتی ہے۔

عمانوئیل کانٹ :

اس دور کے عظیم فلسفی عمانوئیل کانٹ (IMMANUEL KANT) (۱۷۲۴ء — ۱۸۰۴ء) کا کہنا ہے کہ خیر و شر کے بنیادی اصول ازل سے معلوم و مشہور ہیں اور یہ اخلاقی اصول انسان کی عقل اور اس کی فطرت میں مرقوم ہیں۔ اس نے خیر و شر کو پرکھنے کے لیے ایک کسوٹی بھی دی ہے کہ جو چیز تم اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرو۔ اس کے نزدیک یہ اصول غلط ہے کہ ہر کام وہ اچھا ہے جس کا مآل اچھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی فعل کے نتائج اس کے اچھے اور برے ہونے کو متعین نہیں کرتے بلکہ جو کام اخلاقی اصولوں کی پاسداری میں کیا جائے وہ اچھا ہے۔ اگر وہی کام

کسی غرض کے لیے کیا جائے، خواہ وہ مقصد نیک ہی ہو تو وہ کام اچھا نہیں ہو سکتا۔ کانٹ کا کہنا ہے کہ ہمیشہ وہ کام کرو جس کی دوسرے لوگ بھی پیروی کرنا پسند کریں۔

جان فخٹے (JOHANN FICHTE) (۱۷۶۲ء — ۱۸۱۴ء) خیر و شر کے معاملہ میں کانٹ کے نظریہ کا قائل ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خیر و شر کے بنیادی اصول انسان کی فطرت کے اندر موجود ہیں۔ یہی کلیات خیر و شر کا معیار اور کسوٹی ہیں۔ ان اخلاقی قوانین کا محض احترام کافی نہیں ان پر عمل کرنا بھی بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ نیکی کسی ایسی حالت کا نام نہیں ہے جس پر پہنچ کر انسان ٹھہر جائے بلکہ نیکی ایک جہد مسلسل کا نام ہے کہ انسان ہر قسم کے حالات میں اخلاقی قوانین کی پابندی کرتا ہے۔

آرتھر شوپنہائر :

جرمنی کے قنوطی فلسفی آرتھر شوپنہائر (ARTHUR SCHOPENHAUER) (۱۷۸۸ء — ۱۸۶۰ء) کا کہنا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا اور بنیادی داعیہ زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ دنیا میں تمام کش مکش کی وجہ بھی یہی ہے۔ یہی داعیہ بس کی گانٹھ ہے۔ تمام برائیاں اور مصیبتیں اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اندھی خواہشوں کے درمیان ازل سے کش مکش جاری ہے۔ جہاں طاقت ور کمزور کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے وہاں شر پیدا ہوتا ہے۔ یہ دنیا شر کی دنیا ہے۔ نیکی کا اس میں کوئی وجود نہیں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اگر انسان اپنی خواہشوں کو نظر انداز کر کے دوسروں کے ساتھ ہمدردی کے ساتھ پیش آئے اور دوسروں کے لیے زندہ رہے تو دنیا میں نیکی کا چلن ہو سکتا اور امن و چین قائم ہو سکتا ہے۔

جان سٹوارٹ مل :

دور جدید کے فلسفیوں کے نزدیک خیر و شر کے اصول ازلی اور ابدی نہیں ہیں بلکہ معاشرتی اور سماجی حالات کے مطابق یہ اصول بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے خیر و شر کے اضافی ہونے کا نظریہ پیش کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک قسم کے حالات میں ایک فعل اچھا سمجھا جائے گا لیکن مختلف حالات میں وہی فعل برا سمجھا جائے گا۔ اس نظریہ کا سب سے بڑا نمائندہ جان سٹوارٹ مل (JOHNSTUART MILL) (۱۸۰۶ء — ۱۸۷۳ء) ہے جس نے سود مندی کا نظریہ پیش کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ اکثریت کے لیے سب سے بڑا خیر نیکی اور بدی کی کسوٹی ہے۔ اگر کسی فعل سے لوگوں کی اکثریت کو فائدہ پہنچتا ہے تو وہ اچھا ہے اور اگر کوئی فعل اکثریت کے لیے سود مند نہیں تو وہ برا ہے۔

جرمی بینتھم :

جرمی بینتھم (JERMY BENTHAM) (۱۷۴۸ء — ۱۸۳۲ء) بھی سود مندی کے نظریہ کا قائل ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ نیکی اور بدی کا تعین سماجی عوامل کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی فعل سے دوسروں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کے نزدیک اخلاقیات محض اضافی چیز ہیں۔ اس کے ایسے کوئی اصول نہیں جو انسان کی فطرت کے اندر موجود ہوں اور وہ خدائے ازل نے متعین کر دیے ہوں جن کی پابندی سے خدا خوش ہوتا اور ان کی خلاف ورزی سے ناراض ہو جاتا ہو۔

ہربرٹ سپنسر :

ہربرٹ سپنسر (HERBERT SPENCER) (۱۸۲۰ء — ۱۸۰۳ء) نے خیر و شر کی سائنسی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اس کے لیے اس نے نظریہ ارتقا کو بنیاد بنایا۔ اس نظریہ کے مطابق انسان خود کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق برابر ڈھالتا رہتا ہے اس لیے اس کا طرز عمل بھی ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ لہٰذا انتہائی ترقی یافتہ طرز عمل ہی بہترین طرز عمل یعنی خیر ہو سکتا ہے۔ بہترین طرز عمل سے مراد یہ ہے کہ انسان کی زندگی اور اس کا معاشرہ آسائشوں اور رنگینیوں کا مرقع بن جائے۔ دوسرے الفاظ میں اسپنسر بھی نسبتی خیر و شر کا قائل ہے لیکن وہ یہ نقطۂ نظر بھی رکھتا ہے کہ خیر مطلق فوری مسرت کا نام نہیں بلکہ ایسے معاشرہ کا قیام ہے جس میں انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر خوش و خرم رہ سکے۔

جیمز اور ڈیوی :

ولیم جیمز (WILLIAM JAMES) اور جان ڈیوی (JOHN DEWEY) (۱۸۵۹ء — ۱۹۵۲ء) تجرباتی مکتبہ فکر (PRAGMATIC SCHOOL) کے نمائندہ ہیں۔ ان کے دور میں چونکہ جمہوریت کا بڑا غلغلہ تھا۔ اس لیے انھوں نے معاشرہ کے مفاد اور انفرادی حقوق کو بڑی اہمیت دی۔ ان کے نزدیک فرد اور معاشرہ ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ انسان کی انفرادیت معاشرہ کے ایک رکن ہی کی حیثیت سے ہے۔ ان کے نزدیک خیر وہ ہے جس کے ذریعے بحیثیت مجموعی ایک معاشرہ اور معاشرہ کے افراد کا مفاد پورا ہوتا ہے۔ اچھا عمل وہ ہے جو ایک فرد کو ذریعہ نہیں بلکہ اپنی ذات میں خود ایک مقصد قرار دیتا ہے لیکن اس کے باوجود معاشرہ کی بہبود لازماً پیش نظر رہے گی۔ سماجی اکائی کی حیثیت سے انسانی فرد خیر و شر کا پیمانہ ہے۔ گویا فعل کے

انفرادی و سماجی نتائج خیر و شر کی بنیاد ہیں۔

اہل فلسفہ کی آراء پر تنقید

یہ تھا خلاصہ مشہور فلسفیوں کی آراء کا جنہوں نے خیر و شر کے مسئلہ سے تعرض کیا ہے اور ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جن کا حوالہ ہم نے مضمون کے شروع میں دیا تھا۔ اب ہم ان کے جوابات کا جائزہ لیں گے۔

اضافیت کا فلسفہ :

سب سے پہلے ان فلسفیوں کو لیجیے جنہوں نے خیر و شر کو نغمہ کے زیر و بم اور تصویر کے سرخ و سیاہ دھبوں سے تشبیہ دی ہے۔ ان فلسفیوں کے نمائندے ہیراقلیطس اور سینٹ آگسٹائن ہیں۔ ان کے نزدیک جس طرح نغمہ میں زیر و بم اور تصویر میں سرخ و سیاہ دھبوں کی اہمیت ہوتی ہے اور ان سے اس کی دل کشی میں اضافہ ہوتا ہے اسی طرح نیکی اور بدی دونوں دنیا کے لیے ضروری ہیں۔ ان سے دنیا کی رنگینی میں اضافہ ہوتا ہے۔

ہمارے نزدیک ان فلسفیوں کا خیر و شر کو اشیاء پر قیاس کر لینا ان کے فکر کو غلط رخ پر لے گیا۔ خیر و شر کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔ گویا سوال اشیاء کے اچھے اور برے ہونے کا نہیں ہے بلکہ اخلاقی حسن و قبح کا ہے۔ اشیاء میں تو کسی چیز کے اچھے اور برے ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ہر چیز کی اپنی افادیت ہوتی ہے۔ گھورے کی کھاد بھی اپنے محل میں بڑی قیمت رکھتی ہے اور ہیرے اور جواہرات بھی بڑی قیمت رکھتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جھوٹ اور سچ یا رحم اور ظلم دونوں ٹھیک ہیں یا جھوٹ، بے ایمانی، فریب کاری، بدکاری اور بدمعاشی بھی کسی محل میں عمدہ ہو جاتے ہیں؟ یہ ثابت کرنا ممکن نہیں کہ کسی موقع پر یہ چیزیں بھی مفید یا پسندیدہ ہو جاتی ہیں ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو چیزیں ایک محل میں جائز نہیں ہوتیں دوسرے محل میں وہ بدرجۂ مجبوری گوارا کر لی جاتی ہیں مثلاً جھوٹ تو ہمیشہ ہی برا ہے لیکن فرض کر لیجیے کہ کوئی ظالم کسی شخص کی جان لینا چاہتا ہے۔ وہ اس کی تلاش میں ہے اور آپ سے پوچھتا ہے کہ کیا آپ نے اس کو ادھر دیکھا ہے۔ آپ مظلوم کو اس کے شر سے بچانا چاہتے ہیں اور جھوٹ بول دیتے ہیں کہ آپ نے نہیں دیکھا۔ تو یہ جھوٹ اس لیے گوارا کر لیا جائے گا کہ بہرحال آپ نے بدرجۂ مجبوری بولا ہے۔ اسی طرح آپ کو اضطراری حالت میں کوئی حرام چیز کھانے کی اجازت ہے لیکن اس طرح وہ چیز طاہر اور حلال نہیں ہو جاتی۔ لہٰذا اشیاء کے متعلق تو یہ کہنا درست ہے کہ گندی سے گندی چیز بھی کھیت میں کام دے دے گی۔ لیکن اخلاقی برائیوں کے متعلق یہ

نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا جواز صرف مجبوری کی حالت میں نکلتا ہے۔ اس لیے خیر و شر کو نغمے کے زیر و بم یا تصویر کے سرخ و سیاہ دھبوں سے تعبیر کرنے والے فلسفیوں کا جواب مہمل ہے یا زیادہ سے زیادہ اس کو شاعرانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

نیت و ارادہ کا معیار :

اسی طریقہ سے جن فلسفیوں نے یہ رائے پیش کی ہے کہ کوئی عمل بذات خود اچھا ہے اور نہ برا بلکہ انسان کی نیت اور ارادہ اس کو اچھا یا برا بنا دیتا ہے، ان کی رائے بھی درست معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ نیت و ارادہ کے نیک ہونے سے یہ نہیں ہو سکتا کہ بدی نیکی ہو جائے۔ اگر ایک شخص کے متعلق یہ معلوم ہو کہ اس سے کوئی برا کام سرزد ہو گیا لیکن اس کی نیت اچھی تھی تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ کام اچھا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کو درگزر کے قابل سمجھا جائے گا کہ اس کی نیت بدی کی نہیں تھی۔ پس نیت و ارادہ کو خیر و شر کا معیار بنانا بالکل بے بنیادی بات ہے۔ اس کی کوئی دلیل نہیں۔

لذت اور مسرت کے حصول کا معیار :

لذت اور مسرت کو جن فلسفیوں نے معیار خیر قرار دیا ہے ان کی بات بھی پادر ہوا ہے۔ اس سے قبل جو معیار پیش کیے گئے وہ تو شاعری تھی لیکن یہ رائے بے بنیاد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لذت اور مسرت کا کوئی ایک معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ عوام کی لذت کی چیزیں اور ہوتی ہیں، خواص کی لذت کی چیزیں کچھ اور ہوتی ہیں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عوام کی لذت کی چیزیں خواص کے لیے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ مثلاً گانے کی جو ترنگ بلند ہوتی ہے اس سے ایک مہذب آدمی پریشان ہو جاتا ہے جبکہ دوسرے اپنے گھروں میں بیٹھے اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ مزید برآں عام آدمیوں کے درمیان بھی لذت اور مسرت کے معیار میں فرق ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو ہاکی کھیلنے میں لطف آتا ہے لیکن بعض لوگ اس سے بے مزہ ہوتے ہیں۔ بعض کرکٹ اور بعض دوسرے کھیلوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر ایک چیز سے ایک شخص کو مسرت حاصل ہوتی ہے تو ضروری نہیں کہ دوسرے کو بھی اس سے خوشی حاصل ہو بلکہ بعض اوقات وہ دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔

اگر یہ بات کہی جائے کہ اکثریت کو جس چیز سے لذت اور مسرت حاصل ہو وہ خیر ہے تو یہ بات بھی درست معلوم نہیں ہوتی۔ مثلاً ٹیلیویژن کا فائدہ تو بہت عام ہے۔ لیکن جتنا اس کا فائدہ عام ہے اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ اس کا ضرر بھی عام ہے۔ اس کے علاوہ زمانہ کے لحاظ سے بھی اکثریت کے نقطہ نظر میں فرق پڑ جاتا ہے۔ ایک

زمانہ میں ایک چیز اکثریت کے لیے مسرت کا باعث ہوتی ہے لیکن زمانہ گزرنے کے بعد وہ نفرت کے قابل ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک دور میں لوگوں کو غلام بنانا قابلِ فخر سمجھا جاتا تھا لیکن اب یہ قابلِ نفرت قرار پایا ہے۔ مزید برآں مختلف معاشروں میں لذت و مسرت کے معیار بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک معاشرہ میں سانپ اور مینڈک کھانے میں لوگوں کو بڑا مزہ آتا ہے لیکن دوسرے مقامات پر لوگ ان چیزوں کے کھانے سے خوف زدہ ہوتے ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لذت اور مسرت کا تعلق جتنا اشیائے خارجی سے ہے اس سے بہت زیادہ انسان کی باطنی حالت سے ہے۔ اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ خارجی چیزوں سے مسرت کا تعلق برائے نام ہے۔ حقیقت میں اس کا تعلق انسان کے نفس، اس کے باطن اور قلب سے ہے۔ ایک پریشان حال اور افسردہ آدمی کے سامنے اگر آپ کوئی اچھا نغمہ چھیڑ دیں تو وہ اس سے محظوظ نہیں ہو سکے گا۔ اگر کسی سوگوار اور غم زدہ شخص کے سامنے آپ بہترین کھانا پیش کریں تو وہ اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکے گا۔ انسان کو اگر عقلِ سلیم حاصل ہو اور نفسِ مطمئنہ کی بادشاہی حاصل ہو تو وہ نانِ جویں میں بھی وہ لذت پاتا ہے جو مرغ و ماہی میں اس کو نہیں ملتی۔

سودمندی کا معیار:

اسی طرح سودمندی کا نظریہ ہے کہ جس چیز میں فرد اور معاشرہ کا فائدہ ہو وہ خیر ہے لیکن جن چیزوں میں سودمندی نظر آتی ہے اگر ان کو پرکھ کر دیکھا جائے تو اس میں سب کی ہلاکت نظر آئے گی۔ مثلاً بینکنگ سسٹم ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی سودمندی سے انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ لیکن دوسرے پہلوؤں سے دنیا چیخ رہی ہے کہ اس نظام نے ساری دنیا کو سود کے جال میں پھانس لیا ہے۔ اسی طرح سائنس کی افادیت میں تو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن سائنس نے انتہائی مہلک بم اور ہتھیار ایجاد کر کے اس کا اتنا بھاری ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ ساری دنیا قیامت کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اگر کوئی چھوٹا سا حادثہ ہو جائے تو ساری دنیا بھک سے اڑ جائے گی۔ اس لیے یہ نظریہ بہت مخدوش ہے۔

ڈیکارٹ کا نظریہ:

ڈیکارٹ نے ایک طرف تو خدا کو خیرِ مطلق قرار دیا لیکن دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ خدا نے انسان کو جو عقل دی ہے وہ زندگی کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ناکافی ہے اور انسان کی اس کوتاہی کی بدولت شر پیدا ہوتا ہے۔ اس فلسفے کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے انسان کو ایک بڑی آزمائش میں تو ڈال دیا لیکن بقدرِ ضرورت زادِ راہ نہیں دیا۔ اس نے جتنی مقدار میں جذبات اور رجحاناتِ طبع انسان میں رکھ دیے، ان کو قابو میں رکھنے کے لیے

جتنی فہم و بصیرت کی ضرورت تھی وہ عطا نہیں کی۔ یعنی ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

ڈیکارٹ نے یہ نہیں سوچا کہ ایک پہلو سے وہ خدا کی تعریف کر رہا ہے کہ اس نے انسان کو عقل جیسی اعلیٰ و ارفع صلاحیت سے نوازا ہے اور دوسرے پہلو سے وہ اسے الزام دے رہا ہے کہ زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے یہ صلاحیت ناکافی اور غیر متوازن ثابت ہوئی ہے۔ معلوم نہیں ڈیکارٹ کو اپنے فلسفہ کا یہ سقم کیوں نظر نہیں آیا؟

سپینوزا کا نظریہ:

سپینوزا (SPINOZA) کی یہ بات کہ خدا خیر و شر سے ماورا ہے اور اس کا تعلق صرف انسان سے ہے، بہت تعجب خیز اور اس کے اپنے مذہب کے خلاف ہے۔ وہ وحدت الوجود کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک خدا مجسم (PERSON) شکل میں نہیں ہے کائنات کے مجموعی نظام میں جو حرکت اور سرگرمی ہے یہی خدا ہے اور ہم آپ اس کائنات کے اجزا ہیں اس لیے ہم بھی خدا ہیں۔ اس کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ جب ہم اپنے سے محبت کرتے ہیں تو خدا سے محبت کرتے ہیں کیونکہ ہم خدا ہیں۔ اس لیے جب وہ خیر و شر کو صرف انسان سے متعلق قرار دیتا ہے تو یہ بات اس کے اپنے فلسفہ کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتی۔

فطرت کے الہام کا نظریہ:

تاریخ کے عظیم فلسفی جن میں سقراط، افلاطون، ارسطو، کانٹ، جان لاک، لائبنز سب شامل ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ خیر و شر دو مستقل اور متعین چیزیں ہیں۔ ان کے کلیات فطرتِ انسانی میں مرقوم ہیں۔ اخلاقی قوانین کا شعور انسان کو ازل سے ودیعت ہے۔ ایک نورِ یزدانی اس کے اندر موجود ہے جو اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ بسا اوقات انسان ان اخلاقی قوانین کو بھول جاتا ہے تو اسے یاد دہانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے خود شناسی ضروری ہے۔ یہ اصل علم ہے جو انسان کو راہِ راست پر رکھتا ہے اور یہی خیرِ اعلیٰ ہے۔ اگر انسان کی اپنی صلاحیتیں متحقق ہو جائیں تو وہ نیکی کا راستہ اختیار کرتا اور بدی سے اجتناب کرتا ہے۔ اس طرح وہ کمال کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

میرے نزدیک ان بڑے فلسفیوں کا نقطہ نظر بہت مضبوط ہے۔ میں اس کو درست سمجھتا ہوں اور آگے چل کر بتاؤں گا کہ یہی نقطہ نظر قرآن مجید سے اقرب ہے۔

شر کا وجود :

اب رہ گیا یہ سوال کہ اگر خیر و شر کے الگ الگ وجود ہیں تو کیا ان دونوں کے خالق الگ الگ ہیں۔ بیشتر فلسفیوں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ جن فلسفیوں نے خیر و شر کو اضافی اور نسبتی کہا ہے تو انہوں نے اس مسئلہ ہی کو ختم کر دیا۔ مشرکانہ مذاہب میں خیر کا خالق الگ اور شر کا دیوتا الگ ہے۔ عیسائی متکلمین نے جو (APOLOGISTS) کہلاتے ہیں، اس سوال کا جواب دیا لیکن وہ بھی مشرکانہ ہی ہے۔ ان کے نمائندے تھامس ایکواناس اور سینٹ آگسٹائن کا مذہب یہ ہے کہ خدا خود خیر مطلق ہے اس لیے وہ شر کا خالق نہیں ہوسکتا۔ اس نے انسان کو خیر پر پیدا کیا لیکن دنیا میں مادہ بھی ہے۔ انسان مادہ کی طرف رجحانات رکھنے کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ شیطان نے انسان کو اس طرح پھسلایا کہ اس نے اس کو مادے کی طرف مائل کر دیا۔ یہیں سے شر وجود میں آگیا۔ عیسائی متکلمین کی اس تقریر سے دوئی ثابت ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان شر کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیطان کو کس نے پیدا کیا؟ اس کا جواب عیسائی متکلمین کی سمجھ میں نہیں آیا وہ شیطان کی توجیہ نہیں کر سکے۔ اگر شیطان شر کا منبع ہے اور ایسی طاقت رکھتا ہے کہ وہ جس کو چاہے شر میں مبتلا کر دے تو پھر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ خدا نے یہ شر کیوں پیدا کیا جب کہ وہ خیر مطلق تھا؟

کیا خیر و شر حکمی ہے :

بعض مسلمان متکلمین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہم اخلاقی اصولوں کو اس لیے مانتے ہیں کہ خدا اور رسولؐ نے اس کا حکم دیا ہے۔ چونکہ رسولؐ نے فرمایا ہے کہ جھوٹ، لالچ، ظلم، بے انصافی، ریاکاری بری چیزیں ہیں جن سے بچا جائے اس لیے ہم ان کو برا سمجھتے ہیں۔ اسی طرح رسول نے سچ، ہمدردی، عدل اور رحم کو اچھی اخلاقی صفات قرار دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ ان کی پاسداری کی جائے اس لیے ہم ان کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اگر رسول جھوٹ کو اچھا کہتے تو ہم بھی اس کو اچھا ہی مانتے۔ ان متکلمین نے یہ نہیں سوچا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں کو برا اور بعض کو اچھا بلاوجہ اور بے مقصد ہی قرار دیا ہے تو اس نے انسان کی فطرت میں سچ، عدل اور رحم سے محبت اور جھوٹ، ظلم اور دوسری برائیوں سے نفرت کیوں رکھی ہے؟ اگر فطرت انسانی میں کوئی چیز ودیعت نہیں تو پیغمبروں نے یاد دہانی کس لیے کرائی ہے۔ اگر خیر اور شر صرف حکمی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار یہ کس لیے کہا ہے کہ تم سمجھتے کیوں نہیں، تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے، تم کہاں بھٹک جاتے ہو! اگر ان متکلمین کی رائے صحیح ہوتی تو کلام الٰہی کا انداز یہ ہوتا کہ میں کہتا ہوں اس لیے مانو۔ لیکن اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے انسان

کو بار بار آفاق اور انفس پر غور کرنے کی دعوت دی ہے تاکہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر صحیح نتائج تک پہنچے۔ پس جن لوگوں نے خیر و شر کو حکمی قرار دیا ہے ان کی بات بالکل ہی بے وزن ہے۔

قرآن مجید کی تعلیم

خیر و شر کے ضمن میں قرآن مجید کا سارا فلسفہ انسان کی فطرت اور اس کے مضمرات پر مبنی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ تمام صحیح عقائد و اعمال اور جن اچھائیوں اور نیکیوں کی تعلیم اس نے دی ہے اور جن برائیوں سے انسان کو روکا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے خارج سے اس پر لادی نہیں گئی ہے بلکہ انسان کو انہی باتوں کی یاد دہانی کی گئی ہے جو اس کی اپنی فطرت کے اندر پہلے سے ودیعت ہیں لیکن اس نے ان کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

خیر اعلیٰ — توحید :

قرآن مجید کے نزدیک 'خیر اعلیٰ' خداوند تعالیٰ کی وحدانیت اور ربوبیت کا اقرار ہے۔ اس نے احکام شریعت میں اسے سرفہرست رکھا ہے۔ اس نے جہاں جہاں اخلاق و کردار کے اچھے اوصاف کا حوالہ دیا ہے ان کا سرچشمہ اور ان کی اصل الاصول اسی تصور توحید کو قرار دیا ہے۔ یہ تمام نیکیوں کے لیے شہر پناہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے بغیر کوئی نیکی اور بھلائی محفوظ و مامون نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو واضح فرمایا۔ آپ سے پوچھا گیا: 'أیّ الاعمال افضل' (کون سا عمل سب سے افضل ہے)۔ آپ نے فرمایا 'ایمان باللہ' (اللہ پر ایمان)۔ اسی طرح کسی صحابی نے آپ سے سوال کیا: 'ای الذنب اعظم عند اللہ' (اللہ کی نگاہوں میں کون سا گناہ سب سے زیادہ سنگین ہے)۔ آپ نے جواب دیا: 'ان تجعل للہ ندا وھو خلقک' (یہ کہ تو اللہ کا ہمسر ٹھہرائے حالانکہ وہی ہے جس نے تجھے پیدا کیا)۔

چونکہ تمام انبیائے کرام ایک ہی چشمۂ صافی سے مستفیض ہوتے ہیں اس لیے حضرت مسیح علیہ السلام کا بھی اسی طرح کا جواب انجیل میں منقول ہے۔ اسرائیلی فقیہوں نے جب آپ سے یہ سوال کیا کہ سب حکموں میں اول کون سا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ "اول یہ ہے، اے اسرائیل سن، خداوند ہمارا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ۔" (مرقس ۱۲: ۲۹ — ۳۰)۔

اس خیر اعلیٰ کو خدا نے کس طرح انسان کی فطرت میں سمو دیا ہے اس کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن مجید نے

۔ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم کی ارواح پیدا کیں تو ان سے اقرار لیا کہ وہ اللہ ہی کو اپنا واحد رب بنائیں گے۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ مبادا قیامت کے دن انسان یہ عذر کر دے کہ وہ اس حقیقت سے غافل رہا۔ سورۂ اعراف میں ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰي شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ

(اعراف : ۱۷۲)

اور یاد کرو، جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے ان کی پیٹھوں سے — ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھیرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے ہاں تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کے روز تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ توحید کا تصور انسانی فطرت کے بدیہیات میں سے ہے۔ اس لیے یہ ہر انسان پر ایک حجت قاطع ہے۔ اس باطنی شہادت سے انحراف کے لیے خارجی اثرات کا عذر خدا کے ہاں مسموع نہیں ہوگا۔

قرآن مجید کے اس بیان پر ایک شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اسے اس واقعہ کا منعقد ہونا یاد نہیں۔ اگر ایک آدمی کو اس کا موقع و محل اور تاریخ یاد نہ ہو تو اس سے نفس اقرار کی صحت و صداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انسان پر حجت قائم کرنے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اس اقرار کی یادداشت اس کے اندر موجود ہے۔ چنانچہ جہاں تک ایک خدائے وحدہٗ لاشریک کے اقرار کا تعلق ہے اس پر دنیا بھر کے ہر زمانے کے مشرک اور موحد سب متفق رہے ہیں اس لیے یہ چیز کسی دلیل کے قیام کی محتاج نہیں ہے۔ دلیل کی ضرورت شرک کو ثابت کرنے کے لیے پیش آتی ہے چنانچہ قرآن مجید نے مشرکین سے جگہ جگہ یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ شریکوں کے حق میں کوئی دلیل لائیں۔

خیر و شر کا الہام فطرت میں :

توحید پر جس گواہی کا ذکر مذکورہ آیت میں ہے یہ توحید کے تمام متضمنات اور تقاضوں پر محیط ہے۔ لہٰذا تمام خیر اسی خیر اعلیٰ سے پھوٹتا ہے اور اس اصل کی فروع کی حیثیت رکھتا ہے۔ شر کی حیثیت اس سے متضاد علیحدہ مستقل اقدار کی ہے۔ یہ بات کہ خدا نے اخلاقی خیر اور شر دونوں کا علم انسانی فطرت میں ودیعت کر دیا ہے، سورہ الشمس میں بیان ہوئی ہے۔ فرمایا:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔

(الشمس - ۷ - ۸)

اور کیا ہی عجیب ہے نفس انسانی کی ساخت کہ ہم نے اس کو الہام کر دیں نافرمانی اور اس کے تقویٰ کی باتیں۔

اہل فلسفہ کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی فطرت بالکل ایک لوح سادہ ہوتی ہے۔ اس پر جتنے نقوش بھی ابھرتے ہیں، بعد میں ادراک و شعور کے پیدا ہونے کے بعد محض ماحول کے اثر سے ابھرتے ہیں۔ قرآن کی رو سے یہ خیال محض مغالطہ ہے۔ ماحول کے پاس رطب و یابس روایات کا جو اندوختہ بھی ہے وہ سب انسان کی فطرت ہی کے بناؤ یا بگاڑ کا کرشمہ ہے جو باتیں اس کی فطرت کے اصل منبع سے ابھری ہیں وہ خیر، عدل، حق اور معروف ہیں اور ہر مومن و کافر ان کو اسی حیثیت سے جانتا ہے۔ جن باتوں پر انسان کی خواہشات کی بے اعتدالیاں غالب آگئی ہیں وہ شر اور ظلم، باطل اور منکر بن گئی ہیں اور ہر انسان کی فطرت کی آواز یہی ہے کہ یہ ناپسندیدہ کام ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی کی جدوجہد سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جن متعدد صلاحیتوں اور قابلیتوں سے نوازا ہے، نیکی اور بدی کا شعور بھی ان میں سے ایک ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایات بیان کرتے ہوئے فطرت کی اس تعلیم کو اپنا خاص انعام قرار دیا ہے۔ فرمایا:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ

(بلد - ۸ - ۱۰)

کیا ہم نے اسے دو آنکھیں، زبان اور دو ہونٹ نہیں عطا کیے اور ہم نے اس کو دو راستوں کی طرف راہنمائی نہیں دی!

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو مشاہدہ کے لیے دو آنکھیں اور نطق و بیان کے لیے زبان اور ہونٹ عطا کیے تو صحیح راستہ دیکھنے کے لیے نیکی اور بدی کا شعور بھی عطا فرمایا۔

قرآن مجید اس بات کے حق میں ہے جو ارسطو کہتا ہے کہ انسان کے اندر ایک نور یزدانی ہے۔ قرآن نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نفخ روح سے تعبیر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس نفخ روح کے بعد ہی انسان مسجود ملائکہ بنا۔ جب اللہ تعالیٰ نے تخلیق انسان کے بارہ میں اپنی پوری اسکیم ملائکہ کے سامنے رکھی تو ان کو سجدہ کرنے کا حکم ان الفاظ میں دیا:

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ

(حجر - ۲۹)

جب میں اس کے نوک پلک سنوار لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تب تم اس کے لیے سجدہ میں گر پڑنا۔

یہی وہ نورِ یزدانی ہے جس کا تحقق اگر ہوجائے تو انسان کمال کا وہ درجہ پائے گا جو اس کی فطرت میں مضمر ہے۔

قرآن کا مزید یہ بیان ہے کہ اس دین کی جو انسان کی فطرت میں رکھا ہوا ہے اور انسان جس کو بھلا دیتا ہے، یاددہانی کے لیے انبیاء آتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی وحی لاتے رہے۔ ان کے لائے ہوئے دین کو انسانی فطرت سے کوئی اجنبیت نہ تھی۔ لہٰذا اسے دینِ فطرت ہی سے تعبیر کیا گیا۔ فرمایا:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

پس تم اپنا رخ سیدھا کرو دین کی طرف یکسو ہوکر۔ یہ اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی فطرت کو تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔ یہی سیدھا فطری دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(روم - ۳۰)

معلوم ہوا کہ دینِ اسلام اور فطرت میں کوئی بیگانگی اور دوری نہیں۔ دونوں ایک چیز ہیں جن میں تعلق اجمال اور تفصیل کا ہے۔ جو کچھ فطرت میں لکھا ہوا ہے اس کی تفصیل وحی الٰہی سے ہوتی ہے۔ سورہ نور میں فطرتِ سلیم اور وحی الٰہی کو نورٌ علیٰ نور (روشنی پر روشنی) سے تعبیر بھی کیا ہے۔ یعنی وحی الٰہی تاریکی کے اوپر روشنی نہیں بلکہ روشنی کے اوپر روشنی ہے۔

نفسِ انسانی کا مخفی زاجر:

اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں صرف نیکی اور بدی کا شعور ہی نہیں رکھا بلکہ اس کے اندر ایک مخفی زاجر (نفس لوامہ) بھی رکھا ہے جو اس کو جب وہ کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے ملامت اور سرزنش کرتا ہے اور جب نیکی کرتا ہے تو اس کو شاباش دیتا ہے۔ قرآن نے اس مخفی زاجر کو قیامت کی ایک دلیل کے طور پر پیش کیا ہے:

لَاۤ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَاۤ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ۔

نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں روزِ محشر کی اور نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی۔

(قیامہ - ۱، ۲)

انسان اپنی خواہشوں سے مغلوب ہوکر اپنا توازن کھو بیٹھتا اور برائی کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔ نفس کے اس رجحان کو قرآن میں نفس امارہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے نفس کے اس پہلو

کی طرف یوں اشارہ فرمایا:

وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِىْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوْۤءِ ۔

اور میں اپنے نفس کو بری نہیں قرار دیتا۔ نفس تو برائیوں ہی کی راہ سجھانے والا ہے۔

(یوسف - ۱۲ : ۱۵۳)

لیکن نفس چونکہ نیکیوں کا شعور بھی رکھتا ہے اور اس کی فطرت تقاضا کرتی ہے کہ وہ نیکی پر قائم رہے اس وجہ سے جب توازن برقرار رہتا ہے اس وقت تک وہ اپنے کو بھی اگر اس سے کوئی برائی صادر ہوتی ہے ملامت کرتا ہے اور دوسروں کی برائیوں کو دیکھ کر بھی کڑھتا ہے اور بسا اوقات اس پر ملامت کرتا ہے۔ نفس کے اس پہلو کو نفس لوامہ سے تعبیر فرمایا گیا۔

نفس کے توازن کو درست رکھنے کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ آدمی برابر اپنے رب اور روزِ جزا و سزا کو یاد رکھے۔ یہ یاد نفس کے توازن کو درست رکھتی ہے اور آدمی کبھی اس کی خواہشوں سے اتنا مغلوب نہیں ہوتا کہ بالکل ان کے آگے سپر انداز ہوجائے۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہوجاتی ہے تو نفس لوامہ اس کو فوراً ٹوکتا ہے اور وہ فوراً متنبہ ہوکر توبہ و انابت سے اس داغ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس نفس کے اندر یہ توازن پیدا ہوجائے قرآن نے اس کو نفسِ مطمئنہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ تربیت نفس کا سب سے اونچا مرتبہ یہی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دعوت دی ہے اور شریعت کے ذریعہ جس کا اہتمام فرمایا ہے۔ اسی نفس کو آخرت میں راضیۃ مرضیۃ کا مقام حاصل ہوگا جو نفسِ انسانی کی معراج ہے۔

قرآن مجید نے تخلیق انسانی کے رموز سے آگاہ کرتے ہوئے اس کی فطرت کے بارہ میں جو کچھ بتایا ہے کیا یہ دعویٰ ہی دعویٰ ہے یا اس کی کوئی دلیل بھی ہے۔ آیئے اس پہلو سے غور کریں۔

فطرت میں خیر و شر کا تصور بدیہی امر ہے:

انسانی فطرت کے اندر نیکی اور بدی ودیعت ہونے کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ یہ از قبیل بدیہیات ہے۔ یعنی یہ بات اتنی روشن اور واضح ہے کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ دوسری تمام دلیلیں ہیچ ہیں۔ دلیل وہاں درکار ہوتی ہے جہاں دلیل دعویٰ سے زیادہ واضح ہو۔ اگر دعویٰ خود زیادہ واضح ہو تو دلیل بے کار ہو جاتی ہے۔ اب جو چیز میں محسوس کرتا ہوں، اسے اپنے دل کی آواز پاتا ہوں تو دوسرا کوئی شخص لاکھ اس کے خلاف مجھے قائل کرنا چاہے میں اس کی بات نہیں مانوں گا۔ دل میں اگر درد ہوتا ہے یا پیٹ دکھتا ہے تو اس کو مریض محسوس کرتا ہے، اس کے لیے خارج سے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص مریض کو قائل کرنا

چاہے کہ اسے کوئی تکلیف نہیں تب بھی وہ اسے ماننے سے انکار کر دے گا کیونکہ وہ اپنے اندر اسے محسوس کرتا ہے۔ سورج پر آپ دلیل قائم کرنا چاہیں تو کیا دلیل قائم کریں گے؟ کوئی دلیل سورج سے زیادہ روشن تو ہو نہیں سکتی۔ اس پر دلیل تو صرف یہ ہے کہ آپ آنکھ کھولیں اور دیکھیں۔ اسی طرح دل گواہی دیتا ہے اور کبھی شبہ میں نہیں پڑتا کہ سچ اچھی چیز ہے اور جھوٹ بری چیز ہے۔ ظلم بری چیز ہے انصاف اچھی چیز ہے۔ نیکی، رحم مروت، رافت، شفقت اعلیٰ اخلاقی جوہر ہیں تو دل کی اس گواہی کو ثابت کرنے کے لیے اور کون سی دلیل ہو سکتی ہے جو اس سے بھی زیادہ قوی ہو۔

توارث اور تواتر :

دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ انسان کا ضمیر ہر گناہ پر برابر اس کو ٹوکتا رہتا ہے۔ اگر برائی کا شعور انسان کی فطرت میں نہ ہوتا تو ہرگز یہ ممکن نہ تھا کہ مختلف براعظموں، ممالک اور مختلف قومیتوں اور مذاہب کے باشندوں کے درمیان بنیادی نیکیوں اور بنیادی برائیوں کے بارے میں اس قدر اتفاق رائے پایا جاتا۔ جب لوگوں کے رہن سہن، رسم و رواج، ثقافت و تہذیب ہر چیز میں اختلاف موجود ہے تو صرف نیکی اور بدی کے احساس ہی میں اتفاق رائے کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ اتفاق رائے اس لیے پایا جاتا ہے کہ فاطر نے انسان کی فطرت ہی کے اندر خیر و شر کا احساس و شعور سمو دیا ہے۔ اسی چیز کو قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے:

بَلِ الْإِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ	انسان تو خود اپنے آپ پر حجت ہے خواہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے۔

(قیامۃ - ۱۴ : ۱۵)

بنی نوع انسان میں نیکیوں کا نیکی ہونا اور بدیوں کا بدی ہونا اس طریقہ سے معلوم اور مشہور ہے کہ اس توارث اور تواتر کو کسی طریقہ سے توڑا نہیں جا سکا۔ بعض سوسائٹیوں میں اس کے خلاف بغاوت تو ضرور ہوئی لیکن دنیا کے اجتماعی ضمیر نے اس کو کبھی گوارا نہیں کیا۔ مثلاً پارسیوں کے ہاں بہن کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دے دیا گیا یا اسپارٹا والے کمزور بچوں کو قتل کر دیتے یا اہل عرب لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تو یہ خاص قبیلوں اور خاندانوں کے اندر کی ایک بیماری تھی، عقل عام نہ صرف یہ کہ کبھی اس کے حق میں نہیں ہوئی بلکہ ان لوگوں کو بھی فطرت کا مجرم ہی گردانتی رہی۔

خیر و شر کی ایک فطری کسوٹی :

ایک عام مشاہدہ یہ بھی ہے کہ وہ لوگ جو برائی کا ارتکاب یا دوسروں پر ظلم کرتے ہیں وہ نہ تو اپنے

کام کو کبھی نیکی سمجھتے ہیں اور نہ یہ گوارا کرتے ہیں کہ کوئی دوسرا شخص بھی ان کے ساتھ وہ سلوک کرے جو وہ خود ان سے روا رکھتے ہیں۔ اسی لیے یہ اصول بھی انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ دوسروں کے لیے بھی وہ بات پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند نہیں کرتا۔ یہ اصول خیر و شر کے لیے ایک کسوٹی مہیا کرتا ہے۔ جس پر شر کا شر ہونا جب متعین ہو جاتا ہے تو خیر کا خیر ہونا بھی متعین ہو جاتا ہے۔ فطرتِ انسانی کے اسی پہلو کی طرف سورۃ تطفیف میں توجہ دلائی ہے۔ فرمایا:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ	برا ہو ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا، جو دوسروں سے جب ناپائیں تو پورا ناپائیں اور جب ان کے لیے ناپیں یا تولیں تو اس میں کمی کر دیں۔

(تطفیف : ۱ - ۳)

یعنی 'آنچہ خود را نمی پسندی دیگراں را مپسند' کا اصول انسانی فطرت پر مبنی ہے۔ یہ اصول صحیح اور غلط رویہ کو بغیر کسی خارجی ثبوت کے بالکل واضح کر دیتا ہے۔

فطرت اختیار و ارادہ کے ساتھ ہے :

یہاں ایک بڑا اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خیر و شر کا امتیاز ایک فطری چیز ہے تو پھر دنیا کی اکثریت اس سے باغی کیوں ہے؟ فطری چیز کا تقاضا تو یہ تھا کہ سب لوگ اسی راستہ پر ہوتے یا کم سے کم اکثریت اس راستہ پر ہوتی لیکن اکثریت تو نیکی کے راستہ سے ہٹی ہوئی ہے اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے چند باتیں ذہن میں رکھنی چاہییں۔

ایک یہ کہ جبلت اور فطرت میں فرق ہے۔ حیوانات کی جبلت اور چیز ہے اور انسان کی فطرت اور چیز ہے۔ حیوانات تو جبلت کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں، اس سے سرمو انحراف نہیں کر سکتے۔ بلی چھچھڑے، دودھ اور گوشت کھاتی ہے۔ سیب اور انگور دیکھیے تو مر جائے گی لیکن اس کو کھانا گوارا نہیں کرے گی۔ شیر گوشت کھاتا ہے بھوکا مر جائے گا لیکن گھاس نہیں کھائے گا۔ انسان کا حال اس سے بہت مختلف ہے وہ چاہے تو زہر کو تریاق بنا لے، درختوں کے پتوں، جڑوں اور گھاس پھونس سے اپنا پیٹ بھر لے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی فطرت اختیار اور ارادہ کے ساتھ ہے۔ سب سے بڑا تاج جو انسان کو ملا ہے وہ اختیار اور ارادہ کی قوت ہی ہے ورنہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہ رہ جاتا۔ انسان کی خلافت کے معنی بھی یہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایک خاص دائرہ میں اختیار دے کر دیکھ رہے ہیں کہ وہ کیا بناتا ہے۔ اس اختیار کا یہ اثر ہے کہ اگر آپ چاہیں تو اپنی فطرت کو بگاڑ سکتے ہیں۔ خیر کو جانتے ہوئے آپ اپنی خواہش سے مغلوب

ہو کر برائی بھی کر سکتے ہیں اور اس برائی کو خیر کہنے پر اصرار بھی کر سکتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ انسان کو عقل کی جو دولت ملی ہوئی ہے اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ جب دلائل تراشنے پر آئے تو حق کی حمایت اور مخالفت دونوں میں دلائل تراش لیتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ انسان اپنی فطرت پر آزادانہ تصرف کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ جانتے ہوئے کہ حق، نیکی، صداقت، فتوت، حمیت اور غیرت یہ ہے، ایمان کا تقاضا یہ ہے، خدا کا فرمان یہ ہے، رسول کا ارشاد یہ ہے، انسان جب عقل کو کہتا ہے کہ میں ان سب کے خلاف یہ کرنا چاہتا ہوں، اس کے لیے دلائل تراش، تو وہ ایسا کر دیتی ہے اور انسان اپنی خواہشات اور جذبات سے مغلوب ہو کر عقل کی مدد سے اپنے ضمیر کو تسلی دے دیتا ہے۔

شر اختیار کے سوء استعمال سے پیدا ہوتا ہے:

جہاں تک جذبات، خواہشات اور رغبات کا تعلق ہے یہ انسان کی تشکیل کا ضروری جزو ہیں اس کے بغیر انسان، انسان نہیں ہو سکتا۔ انسان اگر چاہے تو یہ چیزیں حدود کے اندر رہ سکتی ہیں اور اگر نہ چاہے تو انسان ان چیزوں کا غلام بھی بن سکتا ہے۔ لہٰذا انسان اپنے اختیار کو استعمال کر کے نافرمانی کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہو تو وہ اس کو ڈھیل دے دیتا ہے لیکن اختیار نہیں چھینتا، کیونکہ اختیار چھین لینے کے بعد انسان بے کار ہو جاتا ہے۔

اب یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان برائی میں جو مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے اختیار کے سوئے استعمال سے ہوتا ہے، اور یہیں سے شر پیدا ہوتا ہے۔ انسانوں کی بڑی اکثریت اپنی خواہشات سے مغلوب ہو کر شر کو اختیار کر لیتی ہے یا اپنی فطرت میں بگاڑ پیدا کر لیتی ہے۔ نتیجۃً ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ فطرت کے مطابق زندگی گزارنے والے لوگ تعداد میں کم ہیں۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس کی خلاف ورزی کرنے والے ہیں۔

خیر و شر کا خالق کون ہے؟:

رہ گیا یہ سوال کہ کیا خیر و شر دونوں کا خالق ایک ہی ہے یا ان کے الگ الگ خالق ہیں، اگر خیر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور شر کا خالق کوئی اور ہے تو اس سے کائنات میں ثنویت لازم آتی ہے اور اگر خدا ہی خیر اور شر دونوں کا خالق ہے تو خدا جب خیر مطلق ہے وہ شر کا خالق کس طرح ہو سکتا ہے، تو اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے اختیار و ارادہ کے غلط استعمال کی وجہ سے دنیا میں شر پیدا ہوتا ہے۔ انسان اپنے اختیار کو خیر کے لیے بھی استعمال کر سکتا ہے اور وہ اس کو بدی کے لیے بھی بروئے کار لا سکتا ہے۔ یہ

کائنات جن طبیعی قوانین پر قائم ہے ظاہر ہے کہ وہ خالق کے لحاظ سے موجب خیر ہیں لیکن ان کے علم یعنی سائنس کو انسان کی خدمت میں بھی لگایا جا سکتا ہے اور مہلک ہتھیار بنا کر انسان کی تباہی کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، چھری پھل کاٹنے کے لیے بھی استعمال ہو سکتی ہے لیکن اسی سے دوسرے انسان کو ہلاک بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ اب آپ کا اختیار ہے کہ آپ ایٹمی طاقت کو انسان کی بھلائی کے لیے استعمال کریں یا اس کی تباہی کے لیے۔ اگر آپ ایٹمی طاقت کو انسانوں پر ظلم و ستم ڈھانے اور نسل انسانی کی تباہی کے لیے استعمال کرتے ہیں تو آپ کو اس کا اختیار حاصل ہے لیکن یہ اختیار کا غلط استعمال ہوگا۔

چونکہ اختیار و ارادہ کی آزادی تو بہت بڑی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہے اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہی نعمت تو اس کا درجہ حیوانات سے بلند کر کے اسے منصب خلافت پر فائز کرتی ہے اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اختیار کی آزادی سے پیدا ہونے والے شر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ تو سراسر خیر ہے۔ یہ انسان کی حماقت ہے کہ وہ اختیار کا غلط استعمال کرتا ہے اور شر کا باعث بنتا ہے۔

نفع عاجل شر کا سبب بنتا ہے:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی فطرت پر جو آزادانہ تصرف حاصل ہے وہ اس کو برائی کے لیے کیوں استعمال کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نفع عاجل کی لالچ میں انسان بدی کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ بدی کا مزا تو اس کو نقد نقد حاصل ہو جاتا ہے لیکن نیکی اور اخلاقی اصولوں کی پاسداری کے نتائج فوری برآمد نہیں ہوتے اس کے لیے طویل انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ مشکل ہر برائی کی اصلاح کی کوشش میں پیش آتی ہے۔ اگرچہ سگریٹ پینے والوں اور شراب نوشی کرنے والوں کو ڈاکٹر سگریٹ اور شراب کے مہلک اثرات سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان سے وقتی لذت اور سرور حاصل ہو جاتا ہے اس لیے اس عادت میں مبتلا شخص اس کے دور رس نتائج کو جانتے بوجھتے ہوئے نظر انداز کر دیتا ہے اور وقتی لذت اور سرور کی خاطر ان کو استعمال کرتا رہتا ہے۔ یہی حال اخلاقی برائیوں کا بھی ہے۔ جھوٹ اور فریب کے ذریعہ انسان فوری فائدہ اٹھا لیتا ہے اور اس کے بُرے اثرات اس کو نظر نہیں آتے اور نہ ہی اس کو دکھائے جا سکتے ہیں۔ قاتل دوسرے شخص کو ہلاک کر کے مادی فائدہ اٹھا لیتا یا انتقام کی آگ بجھا لیتا ہے لیکن اس سے معاشرہ میں دور رس اور وسیع پیمانہ پر جو مفاسد پیدا ہوتے ہیں ان سے بے خبر رہتا ہے مزید برآں سچ، دیانت داری، ہمدردی اور دوسری نیکیوں کا کوئی فوری فائدہ نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات اس طرز عمل کو اختیار کرنے والوں کو مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان نیک کاموں کے اچھے

اثرات ظاہر ہونے میں طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر انسان نفع عاجل کی لالچ میں اپنی فطرت پر تصرف کرکے برائی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

شعلۂ یزدانی :

اس طرح جو لوگ نفع عاجل کی لالچ میں برائی کرتے رہتے ہیں ان کی فطرت رفتہ رفتہ مسخ ہو جاتی ہے لیکن جو لوگ نفس لوامہ کی سرزنش پر توجہ دیتے ہیں اور فوری فائدہ کی بجائے دور رس نتائج پر نظر رکھتے ہیں وہ سلیم الفطرت لوگ ہوتے ہیں جن کی فطرت کو اللہ تعالیٰ نے سورہ نور میں اس روغن سے تشبیہ دی ہے جو اتنا صاف اور شفاف ہوتا ہے کہ "دیا سلائی کو دیکھتے ہی بھڑک اٹھتا ہے اگرچہ آگ اس کو نہ چھوئے" (یَکَادُ زَیْتُهَا یُضِیْءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ) ایسے سلیم الفطرت لوگوں کے لیے پیغمبر کی بات اور ان کی شکل ہی معجزہ ہوتی ہے۔ ان کے اندر نور یزدانی موجود ہوتا ہے جو حق کے واضح ہوتے ہی بھڑک اٹھنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اس طرح کے لوگ پیغمبر کی بات کو اپنے دل کی بات سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص پیغمبر کی دعوت سے بیگانگی محسوس کرتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے اندر شعلہ یزدانی (PILOT FLAME) بجھ چکا ہے۔ جو لوگ اپنی فطرت بگاڑ لیں تو قرآن نے ان کا حال یہ بیان کیا ہے کہ وہ پیغمبر کی بات سے بدکتے ہیں۔ سورہ ہود میں انبیاء کی زبان سے یہ بات کہلوائی گئی ہے۔

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ
(ھود - ۲۸)

اس نے کہا: اے میرے ہم قومو! بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور پھر اس نے خاص اپنی رحمت سے بھی مجھے نوازا اور وہ تم سے پوشیدہ رہی تو کیا ہم اس کو تم پر چپکا دیں جب کہ تم اس سے بیزار بھی ہو!

شیطان کا شجرہ نسب :

رہ گیا یہ سوال کہ برائی پھیلانے میں شیطان کا کیا رول ہے تو اس معاملہ میں سینٹ آگسٹائن بھی جو بہت ذہین عیسائی متکلم ہے معاملہ کو سمجھ نہ سکا اور شیطان سے ہار گیا۔ اس لیے کہ وہ شر کے علمبردار شیطان کا ایک مستقل وجود مانتا ہے جس سے اس عقیدہ کو تقویت ملی ہے کہ دنیا میں یزدان اور اہرمن کی الگ الگ

حکومت ہے اور یہ دونوں برسرپیکار رہتے ہیں۔ شیطان کے شجرہ نسب کے بارے میں قرآن نے جو کچھ بتایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے۔ شیطان جنات میں سے بھی ہو سکتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔ آدم کو جس شیطان نے دھوکا دیا تھا اس کا لقب ابلیس تھا۔ اس کی قرآن میں تصریح ہے:

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ

وہ جنات میں سے تھا اور اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔

یہ خیال کہ وہی شیطان جس نے حضرت آدم کو دھوکا دیا تھا ابھی تک زندہ ہے اور وہی انسانوں کو دھوکا دیتا ہے بالکل بچگانہ ہے۔ شیطان نے اللہ تعالیٰ سے جو اجازت مانگی تھی وہ اپنے مشن کو قائم رکھنے کی اجازت تھی تاکہ قیامت تک انسانوں کو گمراہ کر سکے اور یہ ثابت کر دے کہ خدا کی پیروی کرنے والے لوگ بہت کم ہیں۔ اللہ میاں نے فرمایا کہ جا میں تجھ کو اور تیرے پیروؤں کو اجازت دیتا ہوں کہ انسانوں کو گمراہ کرو اور جو تیری پیروی کریں گے خواہ وہ جنات میں سے ہوں یا انسانوں میں سے، سب کو میں جہنم میں جھونک دوں گا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات میں صالحین اور ابرار بھی ہیں اور شیاطین بھی۔ جو قانون تمام جنات پر لاگو ہے وہی ابلیس پر بھی ہوگا۔ جب جنات ابدی مخلوق نہیں تو ان کا ایک فرد ابلیس کیسے ابدی ہو سکتا ہے۔ اس لیے شیطان کوئی ابدی مخلوق نہیں۔ لہٰذا ثنویت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

قرآن میں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ شیطان جس طریقہ سے جنوں میں سے ہوتے ہیں اسی طریقہ سے انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں بلکہ اب تو انسانوں میں جیسے جیسے شیطان پیدا ہو رہے ہیں، جنات ویسے شیاطین پیدا نہیں کر سکتے۔

شیطان کا رول :

انسانی زندگی میں شیطان کا رول وسوسہ اندازی سے زیادہ کچھ نہیں۔ شیطان کو خدا نے یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ جس انسان کو چاہے لازماً گمراہ کر دے۔ اس کو صرف یہ اختیار دیا گیا کہ وہ وسوسہ اندازی کر سکتا ہے۔ سورہ الناس میں اس کے رول کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ

کہہ: میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے رب کی، لوگوں کے بادشاہ کی، لوگوں کے معبود کی، وسوسہ ڈالنے والے دبک جانے والے کی آفت سے، جو دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ جنوں میں

النَّاسِ ٥ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ٥ — سے اور انسانوں میں سے۔

(النّاس - ۱ : ۶)

اس میں شیطان کی تکنیک کی وضاحت ہے کہ اس کا سارا اعتماد وسوسہ اندازی، پروپیگنڈے اور پرفریب وعدوں پر ہے۔ ان ہی چیزوں سے وہ لوگوں کو اپنے دام تزویر میں پھنساتا ہے۔ پھر جب پھنسا لیتا ہے تو اپنے کو بری قرار دے کر ان بے وقوفوں کی بدانجامی کا تماشا دیکھتا ہے جو اس کے دام میں پھنس کر اپنی دنیا اور عاقبت برباد کر بیٹھے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شیطان کے پاس واحد اختیار وسوسہ اندازی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی امر زور اور اختیار اللہ تعالیٰ نے اس کو نہیں بخشا کہ وہ لازماً لوگوں کو گمراہ کر ڈالے۔ اسی لیے قیامت کے روز وہ اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کے لیے گمراہوں کو مخاطب کر کے کہے گا،

مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طَاغِيْنَ ٥ — ہم کو تمہارے اوپر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا بلکہ تم خود ہی ظالم تھے۔

شیطان پُرفریب وعدوں، طمع کی ہوئی باتوں، ناصحانہ تنبیہات کے علاوہ دھمکیوں سے بھی لوگوں کو ڈرانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اللہ کے جو بندے اس کی دھمکیوں سے مرعوب نہ ہوں تو وہ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے جب اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر یہ کہا کہ میں اولاد آدم کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا تو اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں یہ واضح فرمایا کہ جا تیرا جو جی چاہے کر دیکھ کیونکہ

إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا — میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔ اور تیرا رب کارسازی کے لیے بالکل کافی ہے۔

(بنی اسرائیل - ۶۵)

یعنی جو بندے اپنے رب پر بھروسہ کر کے شیطان کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اللہ تعالیٰ ان کے اعتماد کی لاج رکھے گا اور وہ سرخرو ہوں گے۔

وسوسہ اندازی کے علاوہ شیطان کے کردار کا دوسرا رخ قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ دغاباز اور دھوکے باز ہے۔ جب کوئی شخص اس کے چکمے میں آ کر گناہ کر بیٹھتا ہے تو وہ اس کے نتائج کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو بالکل بری قرار دے کر اس کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ چنانچہ شیطان کی قرآن میں صفت خذول بھی آئی ہے یعنی اپنے مریدوں کو دغا دینے والا۔

وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْإِنْسَانِ خَذُوْلًا — اور شیطان انسان کے ساتھ بڑا ہی بے وفائی کرنے والا ہے۔

شیطان کا یہ کردار سورہ حشر میں نہایت واضح لفظوں میں یوں بیان ہوا ہے۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّيْ بَرِيْءٌ مِّنْكَ إِنِّيْ أَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ — ان کی مثال شیطان کی ہے جو انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر، پھر جب وہ کفر کر چکتا ہے تو اس وقت وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں میں جہانوں کے خداوند سے ڈرتا ہوں۔

(الحشر - ۵۹ : ۱۶)

دنیا کا اجتماعی ضمیر :

اس صورت حال کے باوجود دنیا کا اجتماعی ضمیر کبھی بھی بدی پر مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے ہمیشہ نیکی کے چلن کو رواج دینے کی کوشش کی ہے۔ انسان نے جب سے معاشرتی و اجتماعی زندگی کی کوئی شکل اختیار کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے اندر اس نے حق و انصاف کے قیام کے لیے لازماً ایک نظام بھی قائم کیا ہے۔ اگرچہ بسا اوقات بعض برائیوں نے معاشرہ پر ایسا غلبہ پایا ہے کہ نیکیاں ان کے نیچے دب گئیں لیکن دنیا کے اجتماعی ضمیر نے اس کو گوارا نہیں کیا۔ بلکہ معاشرہ کے اندر ایسے لوگ موجود رہے ہیں جنہوں نے وہی فریضہ انجام دیا ہے جو ہر صحیح الفطرت انسان کے اندر اس کا نفس لوامہ انجام دیتا ہے۔ اگر معاملہ اس حد سے گزر گیا ہے یعنی نیکی کی رمق سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تو قانونِ قدرت نے اس معاشرہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

خلاصۂ بحث :

نیکی اور بدی کے تمام کلیات انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اتمام حجت کے طور پر ان کی بدیہی یاد دہانی فرمائی ہے یعنی، شریعت اور پیغمبر کے ذریعہ ان تمام کلیات اور جزئیات کو وضاحت کے ساتھ بتا دیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص اہتمام ہے جس کو رحمۃً من عند ربک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان اپنی فطرت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوگا۔ جن لوگوں کو پیغمبر کی دعوت پہنچی لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا ان پر دوہرا الزام ہوگا۔ جن تک پیغمبر کی دعوت نہیں پہنچی ان سے بنیادی نیکیوں اور برائیوں کے لحاظ سے ضرور پرسش ہوگی۔

اللہ تعالیٰ خیر مطلق ہے۔ شر انسان اپنے اختیار کے سوئے استعمال سے پیدا کر لیتا ہے۔ گناہ میں بھی وہ اپنے اختیار سے مبتلا ہوتا ہے۔ شیطان کا اس سے زیادہ کوئی دخل نہیں کہ وہ وسوسہ اندازی کر کے انسان کو ورغلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو یہ اختیار ہرگز نہیں دیا کہ وہ کسی شخص کو لازماً گمراہ کر دے۔

اپنے اختیار کا سوءِ استعمال انسان اپنی خواہشات اور جذبات سے مغلوب ہو کر کرتا ہے لیکن یہ جذبات اور خواہشات بذاتِ خود کوئی بری چیز نہیں کہ ان میں سے کسی کو ختم کر دیا جائے جیسا کہ رہبانیت اختیار کرنے والوں نے ان کو ختم کرنے کے لیے جانگسل ریاضتیں ایجاد کی ہیں۔ ان خواہشات اور جذبات کو صرف ایک خاص حد کے اندر رکھنے کی ضرورت ہے۔ غصہ، غضب اور حمیت یہ سب انسانی شرافت کے جوہر ہیں، جن سے اعلیٰ صفات و کردار وجود میں آتا ہے۔ ان کو دبانے اور مٹانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ غصہ کی ایک خاص حد ہے جس سے اگر یہ نکل جائے تو ظلم و تعدی کا باعث بن سکتا ہے۔ اس لیے خواہشات اور جذبات کو کچلنے کی نہیں بلکہ ان کی تہذیب کرنے کی ضرورت ہے جس کی تدابیر پیغمبرؐ نے بھی بتائی ہیں۔

(ترتیب: محبوب سبحانی)

بقیہ: تفسیرِ سورۂ آلِ عمران (۱)

جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں۔ نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں جو لوگوں میں سے عدل و قسط کی دعوت لے کر اٹھے تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔[۲۱]
یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت گئے اور ان کا کوئی مدد کرنے والا نہ بنے گا۔[۲۲]

---

[۲۱] یہ یہود و نصاریٰ کے سابقہ رویے کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کی وہ تدبیریں جو قرآن و اسلام کی مخالفت میں صرف کر رہے ہیں اکارت ہوں گی اور آخرت کی ذلت سے بھی انہیں کوئی بچا نہ سکے گا۔

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

تقدیر اور تدبیر کا تعلق

سوال: یہ کہا جاتا ہے کہ آدمی کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے جب امر واقعہ یہ ہے تو آدمی خواہ مخواہ منصوبے بنانے اور تدبیریں کرنے کے چکر میں کیوں پڑے؟

جواب: تقدیر اور تدبیر کا معاملہ کچھ ایسا باریک اور دقیق ہے کہ اس میں عوام الناس تو کیا، ہمارے متکلمین بھی بے حد الجھے ہوئے ہیں۔ میرے نزدیک معاملہ بالکل صاف ہے۔ تقدیر اور تدبیر دونوں کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ کسی وقت نہ تقدیر تدبیر سے الگ ہوتی ہے اور نہ تدبیر تقدیر سے الگ ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر بدل نہیں سکتی، جو کچھ اس نے لکھ دیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا، جس کام کا جو نتیجہ اس نے مقدر کر دیا ہے اس سے کوئی اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا، موت اور زندگی سب اس کے اختیار میں ہے اور آدمی کی تدبیروں کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ اس نے جس حالت میں مرنا لکھا ہے، جہاں اور جس وقت لکھا ہے وہ پیش آ کر رہے گا۔ تاہم آدمی کی ضروریات ہیں، اس کی ذمہ داریاں ہیں، وہ جن حالات سے دوچار ہوتا ہے ان کے خطرات سے بچنے کے لیے اس کے اندر حوصلہ موجود ہے، تمام معاملات میں اس کی رہنمائی کے لیے اس کے حواس، قویٰ اور عقل کے وسائل اس کو ودیعت کیے گئے ہیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی عقل و فہم کے مطابق، غور و فکر کرے اور اگر مشورہ کی ضرورت ہے تو دوسروں سے مشورہ کر کے تدابیر اختیار کرے اور اپنا فرض اور ذمہ داریاں ادا کرے۔ اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس بنا پر کہ تقدیر کا لکھا سامنے آنے والا ہے، اپنے آپ کو زندگی کی جدوجہد سے ہٹا لے اور کسی دڑبے میں بند ہو کر رہے۔

تدبیر اور تقدیر دونوں سے بندے کا امتحان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ بندہ ایک صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو کس طرح بروئے کار لاتا ہے، وہ اپنی فطرت اور ضمیر کے تقاضوں

کو کس طرح پورا کرتا ہے اور حرام و حلال کا کس طرح خیال رکھتا ہے۔ اس کی اختیار کردہ تدابیر کے باوجود ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ تدابیر کے نتائج سامنے آنے پر بندے پر کیا کیا اثرات پڑتے ہیں اور اس کا رویہ کیسا رہا ہے۔

سورہ یوسف میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے جب بیٹوں کو مصر کے لیے رخصت کیا تو انہیں یہ ہدایت کی کہ الگ الگ دروازوں سے شہر کے اندر داخل ہوں۔ یہ ایک تدبیر تھی جو انہوں نے بیٹوں کو ایک اجنبی شہر میں ممکنہ خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے کی لیکن یہ تدبیر خدا کی مشیت کو نہیں بدل سکتی تھی۔ چنانچہ ان کے بیٹے بن یمین ان سے بچھڑ گئے۔ تدبیر کے اس طرح ناکام ہونے سے ایک بندۂ مومن پر مایوسی طاری نہیں ہوتی۔ اسے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ اگر اپنی سی کوشش کے باوجود میرے حسب منشا نتیجہ نہ نکلا تو خدا کو یہی منظور تھا اور اسی میں حکمت ہے۔ خدا کی جو حکمت ہے خیر بھی اسی میں ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انفرادی طور پر ایک آدمی کے لیے اس میں بظاہر کوئی ضرر کا پہلو ہو لیکن مستقبل کا خیر اسی میں مضمر ہوتا ہے۔ اسی لیے بندۂ مومن ہر حال میں مطمئن رہتا ہے اور اسی میں اس کے ایمان کی جانچ ہوتی ہے۔

صحیح طرز عمل اس بارے میں یہ ہے کہ آدمی کو ہر حال میں اپنا فرض سرانجام دینا چاہیے، اس کے لیے تمام موزوں تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ اگر خطرات کا امکان ہو تو ان کی پیش بندی کے لیے ضروری احتیاطیں بھی کرنی چاہئیں اور ہر قدم پر اَللّٰھُمَّ لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ کی دعا بھی مانگنی چاہیے اس کے بعد یہ یقین بھی رکھنا چاہیے کہ مشیت بہرحال اللہ تعالیٰ کی پوری ہوگی اور وہی ہوگا جو اس نے لکھ رکھا ہے۔ میں خدا ہی کے بھروسہ پر اپنا فرض ادا کرنے نکلا ہوں۔

اس طرز عمل میں اس بات کی تعلیم نہیں ہے کہ آدمی تہوّر میں مبتلا ہو جائے اور بے سوچے سمجھے کام کرنے لگے کہ بہرحال ہوگا تو وہی جو خدا کو منظور ہے اور تقدیر میں لکھا ہے۔ اس مسئلہ کو سیدنا مسیح علیہ السلام نے بہت واضح طریقہ سے سمجھایا۔ انجیل میں آتا ہے کہ شیطان ان کو ایک پہاڑی پر لے گیا اور کہا کہ تم توکل کا بہت وعظ کرتے ہو اگر خدا کے اوپر تمہیں اتنا بھروسہ ہے تو اس پہاڑی پر سے چھلانگ لگا دو اور دیکھو کہ وہ تمہیں کیسے بچاتا ہے۔ اس پر سیدنا مسیحؑ نے فرمایا کہ دور ہو اے شیطان! میرے خداوند نے مجھے اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ مجھے آزمائے، مجھ کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ میں اس کو آزماؤں۔ تہوّر خدا کو آزمانے ہی کی ایک شکل ہے اور ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ ہم خدا کو آزمانے لگ جائیں۔

(ترتیب : خالد مسعود)